سورۃ یٰسٓ

مطالعۂ قرآن

maablib.org

پروفیسر کرار حسین

تلخیص پروفیسر سردار نقوی

الف

مطالعہ قرآن

سورۃ یٰس

پروفیسر کرار حسین

کی تقاریر کی تلخیص

از

پروفیسر سید سردار نقوی

اسلامک کلچر اینڈ ریسرچ سینٹر

ایس ٹی 1/B - فیڈرل بی ایریا بلاک 6 - کراچی

فہرستِ مضامین

- سورۃ یٰسین کے مضامین کا تعارف ۔ ۱
- پہلا رکوع ۱۶
- دوسرا رکوع ۴۷
- تیسرا رکوع ۸۵
- چوتھا رکوع ۱۲۵
- پانچواں رکوع ۱۵۳

(جملہ حقوق محفوظ)

اشاعت ________ ۱۹۸۸ء

طباعت ________ مون پرنٹرز کراچی

ناشر ________ اسلامک کلچر اینڈ ریسرچ سینٹر

ایس ٹی 1/B بلاک 6۔ فیڈرل بی ایریا کراچی

تعداد ________ ۲۰۰۰ بارِ اوّل

ہدیہ ________ ۴۰ روپے

کتابت ________ سید تصویب حسین نقوی

تصدیق نامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

HAFIZ ABDUL RAUF

QUARTER NO. B-22 LABOUR COLONY
S.I.T.E. AREA (WEST) KARACHI

PROOF READER OF
THE HOLY QURAN

Ref. ....Date.... ....

تصدیق نامہ

میں تصدیق کرتا ہوں کہ میں نے اس سورہ یٰس کی تفسیر میں جو قرآنی آیات ہیں ان کو بغور پڑھا ہے میں امید کرتا ہوں کہ اب ان آیات کی عبارت میں کوئی کمی بیشی یا زیر و زبر پیش کی کوئی غلطی نہیں ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ یٰسٓ کے مضامین کا تعارف

سورۃ یٰسٓ مکی سورۃ ہے۔ اس میں پانچ رکوع اور تراسی (۸۳) آیتیں ہیں۔
کلام پاک کی موجودہ ترتیب میں اس سورۃ کا شمار ۳۶ ہے۔ اس سے قبل سورۃ فاطر ہے اور اس کے بعد سورۃ الصّٰفّٰت۔ سورۃ یٰسٓ ۔ کلام پاک کے بائیسویں(۲۲) پارے کے آخر سے شروع ہو کر تیئیسویں(۲۳) پارہ کے پہلے ربع سے کچھ قبل ختم ہوتا ہے۔

کلام پاک کے بعض سورے مختصر سورے کہے جاتے ہیں اور بعض سورے طویل سورے ہیں، لیکن بعض سورے نہ مختصر ہیں اور نہ طویل بلکہ بین بین ہیں، سورۃ یٰسٓ کا شمار اسی تیسری قسم کے سوروں میں ہوتا ہے۔

مطالعہ قرآن کے آداب

اصل سورت کے مطالعے سے قبل مطالعہ قرآن کے ذیل میں کچھ باتوں کی نشاندہی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کلام پاک کی تدوین و ترتیب کا مسئلہ اگرچہ علماء سلف میں کسی حد تک بحث و اختلاف کا موضوع رہا ہے لیکن اب تقریباً تمام علماء خواہ ان کا تعلق کسی مکتب فکر سے ہو اس پر متفق ہیں کہ کلام پاک کی کتابی شکل میں تدوین و ترتیب خود حضورؐ کے زمانے میں ہوئی اور حضورؐ نے وحی الٰہی کی روشنی میں تمام آیتوں کی ترتیب کا کام اپنی نگرانی میں مکمل کرایا۔ اور یہ

ترتیب اور تدوین حضورؐ کے زمانے سے آج تک اپنی اصلی شکل پر قائم ہے اور انشاءاللہ قیامت تک قائم رہے گی۔

اس قول کے حق میں سب سے بین دلیل تو یہی ہے کہ اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے جیسا کہ خود ارشاد ہوا بے شک ہم ہی نے اس کو نازل کیا اور ہمیں اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس حفاظت کا دائرہ صرف الفاظ، کلمات اور آیات کی حفاظت تک محدود نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ یہ کتاب ایک اکائی ہے یہ صرف متفرق آیات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ وہ وحدت ہے جو آیات کی باہمی ترتیب اور ان کے معنوی ارتباط سے عبارت ہے اس لحاظ سے حفاظتِ کتاب کے دائرے میں الفاظ، کلمات اور آیات کے ساتھ آیتوں کی ترتیب اور ان کا باہمی ربط بھی شامل ہے۔

اس کے علاوہ اس باب میں دو حدیثیں بھی ہماری رہنمائی کرتی ہیں ان میں سے ایک حدیث تو وہ ہے جو حدیثِ ثقلین کے نام سے مشہور ہے، حضورؐ نے جب یہ فرمایا کہ میں تمہاری ہدایت کے لئے دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری عترت یعنی اہلبیت، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت یہ کلمات ارشاد فرمائے گئے اس وقت قرآن کتاب کی شکل میں مدون اور مرتب ہو چکا تھا۔

دوسری حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جبرئیل ہر سال ماہِ رمضان میں ایک بار آتے تھے اور حضورؐ انہیں اس وقت تک نازل شدہ قرآن سنایا کرتے تھے، حضورؐ کی رحلت کے سال جبرئیل دوبارہ آئے اور اس طرح حضورؐ نے تمام کلام پاک کو دوبارہ دہرایا یہ گویا قرآن کی آخری اور مکمل شکل تھی اور حضورؐ نے جبرئیل کے خلافِ معمول دوبارہ آنے سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ آپؐ کی دنیاوی زندگی کا آخری سال ہے۔

گویا مطالعۂ قرآن کے ذیل میں ہمیں اس حقیقت کو پیشِ نگاہ رکھنا ہے کہ کلامِ پاک کی آیات کی تنظیم اور ترتیب خود حضورؐ نے اللہ کی ہدایت کے مطابق کی ہے جو کسی تاریخی

ترتیب کے مقابلہ میں بدرجہا پُر معنی ہے۔

دوسری بات جسے نہایت وضاحت سے سمجھنے کی ضرورت ہے یہ ہے کہ کتاب، القرآن، اصول وعقائد، احکام وقوانین، اوامر ونہی اور قصص وحکایات کا صرف مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اس کے مختلف ناموں سے ظاہر ہے یہ فرقان ہے، بیان ہے، نور ہے، ذکر ہے اور اس سے بھی نسبتاً بلند سطح پر یہ کتاب مبین ہے، ام الکتاب ہے، لوحِ محفوظ ہے، امام المبین ہے اس میں ایسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے جس کے علاوہ اور کوئی حقیقت ہے ہی نہیں۔ یہ الحق ہے، یہ اس حقیقت کا بیان ہے جو ناقابلِ بیان ہے، ناقابلِ احاطہ ہے، ناقابلِ ادراک ہے اور یہ حقیقت الفاظ کے ذریعے بیان کی گئی ہے، الفاظ مل کر آیات بناتے ہیں، آیات مل کر سورت بناتے ہیں اور سورتیں مل کر کتاب بناتی ہیں۔ گویا سورت، آیت، لفظ، حرف، نقطہ یہ سب قرآن کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ قرآن ایک وحدت ہے، اور قرآن کے اجزا مل کر بھی ایک کائی ہیں اور خود اپنی اپنی جگہ بھی ایک وحدت ہیں اس لئے کہ ان میں اس عظیم وحدت کا ایک عکس ہے جس کا یہ جزو ہیں بالفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی ہر آیت ایک وحدت ہے، آیتوں کی وحدت مل کر سورت کی ایک وحدت ہے اور تمام سورتیں مل کر قرآن کی ایک وحدت ہے اور یہ وحدت دُر وحدت دُر وحدت ایک ہی وحدت ہے یا یوں کہتے کہ قرآن ایک نقطہ کی وحدت ہے اور یہی نقطہ پھیل کر سورتوں اور پھر آیتوں اور الفاظ میں نمایاں ہُوا ہے۔

بے شک کلامِ پاک ایک ناقابلِ بیان حقیقت کا بیان ہے۔ اور الفاظ اس حقیقت کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں لیکن الفاظ ہی وہ آئینہ ہیں جن کے اندر اس حقیقت کا عکس جھلکتا ہے۔ اور جس طرح آئینہ کو عکس سے جدا نہیں کیا جا سکتا اسی طرح کلامِ پاک کے الفاظ کو اس کے معنی سے جدا نہیں کر سکتے۔ کلامِ پاک صرف معناً ہی نازل نہیں ہوا لفظاً بھی نازل ہوا ہے اس کا ہر لفظ، ہر حرف بلکہ ہر نکتہ منزل من اللہ ہے۔ اس لئے اس کی ہر چھوٹی

سے چھوٹی اکائی میں بھی پوری حقیقت کا عکس جھلکتا ہے۔ قرآن کے الفاظ اللہ کی آیات ہیں، اس کی نشانیاں ہیں، ان کے ذریعے حقیقت اپنے آپ کو منکشف کرتی ہے۔ حقیقت کو بھی ظاہر کرتے ہیں اور اس کی طرف اشارا بھی کرتے ہیں گویا الفاظ آیت بھی ہیں اور علامت بھی ہیں ان الفاظ کے ذریعے کنز مخفی خود کو ظاہر بھی کر رہا ہے مگر اس کے باوجود اسی طرح مخفی ہے جیسا کہ ہمیشہ سے تھا۔ الفاظ مخفی حقیقت کو ظاہر بھی کرتے ہیں اور اس بات کا اشارا بھی کرتے ہیں کہ یہ وہ حقیقت ہے جو اپنے علو اور اپنے عمق ہر دو اعتبار سے ناقابل بیان اور لامحدود ہے اس لئے مخفی ہے۔ بایں ہمہ کلام پاک کے الفاظ اللہ کی آیات ہیں جن میں تقدس اور پاکیزگی کی شان بھی ہے اور لوگوں کے قلوب اور نفوس کو متاثر کرنے کی قوت بھی ہے۔ ہر شخص اپنے ظرف اور بصیرت کے مطابق ان الفاظ کے ذریعے حقیقت کا عرفان حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن حقیقتِ قرآنی تک رسائی حاصل کرنے یا قرآنی اصطلاح میں اسے مس کرنے کی سب پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو طاہر بنائے، اسے تمام توہمات، رجحانات، معادات اور نظریات سے پاک کرے تاکہ اس میں نور اور رحمت کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو سکے جسے قرآن کی شکل میں نازل کیا گیا ہے۔ اہلِ معرفت کی اصطلاح میں اس کو تخلیہ کہتے ہیں۔ جس قدر انسان اپنے نفس کو غیر متعلق باتوں سے پاک کر کے اسے کلام الٰہی کے روبرو کرے گا اسی قدر وہ قرآن کی حقیقت کو قبول کر سکے گا۔ قرآن کا خطاب انسان کی فطرتِ اولیٰ سے ہے۔ تخلیہ کا عمل فطرتِ اولیٰ کی طرف بازگشت ہے۔ کلام الٰہی اور انسان کی فطرتِ اولیٰ میں ہم آہنگی ہے جس قدر انسان اپنی فطرتِ اولیٰ سے قریب ہوتا جاتا ہے۔ یہ ہم آہنگی اسی قدر منکشف ہوتی جاتی ہے اور انسان کلام پاک کے معنوں کو قبول کرنے کا اہل بنتا جاتا ہے۔

کلام الٰہی کی حرمت اور عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو ہر کثافت سے

پاک کرے تاکہ وہ اپنے نفس کو اس کی تمام توانائیوں اور وسعتوں کے ساتھ کلامِ الٰہی کے روبرو کر سکے، اس کے نفس کا ذرّہ ذرّہ خطاب کرنے والے کو لبیک کہہ سکے، یہی وہ منزل ہے جہاں انسان اپنے نفس کی صحیح قدر و قیمت دریافت کر سکتا ہے۔ انسان کی شان یہ ہے کہ اللہ نے اس میں روح میں سے پھونکا ہے، اللہ اور بندے کا یہی وہ تعلق ہے جس کے نتیجے میں انسان اللہ کی معرفت حاصل کر سکتا ہے، انسان کا اللہ سے ایک عہد ہے مگر اس عہد سے غافل ہو کر یا اسے بھلا کر وہ اپنے نفس کو غیر متعلق باتوں میں ملوّث کر لیتا ہے۔ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ وہ ہم سے خطاب کرتا ہے، ہمیں ہمارا بھولا ہوا عہد یاد دلاتا ہے۔ وہ انسان کی حقیقت اور اس کی تقویم اور تقدیر کا ذکر کرتا ہے۔ قرآن کا نام الذکر بھی ہے یعنی یہ بھولی ہوئی حقیقت کو یاد دلاتا ہے۔ یہ انسان کے نفس کو کثافتوں سے پاک کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ نفس کی تربیت اور تزکیہ کا پیغام ہے اور اس تربیت اور تزکیہ کی ایک حد وہ بھی ہے جہاں انسان خود قرآن اور فرقان بن جاتا ہے، یہ من عندہٗ علم الکتاب کی منزل ہے جب علم صرف مسموع کی حدود تک نہیں رہتا بلکہ انسان کی طبیعت کا حصّہ بن جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں علم بوجھ نہیں رہتا۔ نور بن جاتا ہے اور یہ نور زندگی اور اس کی تمام جہتوں کو منوّر کر دیتا ہے۔ اہلِ ایمان اس کی روشنی میں اپنا راستہ طے کرتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کلامِ پاک اللہ کا کلام ہے جو حضورؐ پر وحی کی شکل میں نازل کیا گیا، اس کلام کی حفاظت کا ذمّہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ کلامِ پاک کی ترتیب اور تدوین خود حضورؐ نے وحی کی روشنی میں فرمائی، یہ کتاب تمام دوسری کتابوں سے مختلف اور ممتاز ہے۔ یہ خود بھی ایک معنوی اکائی اور ایک وحدت ہے اور اس کے مختلف اجزاء بھی اپنی جگہ ایک وحدت ہیں، اس کی ہر آیت اور ہر سورت خود اپنی جگہ بھی ایک وحدت ہے اور یہ تمام وحدتیں مل کر کلامِ پاک کی ایک وحدت بناتی ہیں۔

اور یہ وحدت در وحدت در حقیقت ایک ہی وحدت کی مختلف اکائیاں (UNITS) ہیں۔ قرآن کا باطن نور ہے اور اس کا ظاہر لفظ ہیں لیکن ظاہر ہی باطن کو سمجھنے کی کنجی ہے اس لئے قرآن کے لفظوں کو اس کے معنی سے جدا نہیں کر سکتے۔ قرآن کا ہر لفظ آیت بھی ہے اور علامت بھی یعنی ہر لفظ ایک ناقابلِ بیان حقیقت کا مظہر بھی ہے اور اس کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔ کلام پاک کے مطالعہ کا نکتۂ آغاز یہی ہے کہ ہر آیت کے الفاظ کو حتی الوسع سمجھنے کی کوشش کی جائے پھر آیتوں کے مفہوم اور ان کے باہمی ربط کو اپنے قلب میں ایک اکائی کے طور پر نازل کرنے کی سعی کی جائے لیکن اس تمام مرحلہ میں بنیادی شرط طہارت اور اخلاص ہے۔ طہارت میں ظاہری طہارت یعنی جسم کی پاکیزگی بھی شامل ہے اور باطنی طہارت یعنی نفس کی پاکیزگی بھی ضروری ہے، اس کے ساتھ ہی مقصد کی طہارت یعنی اخلاص نیت بھی ایک لازمی شرط ہے حقیقت کی تلاش اور طلب کے علاوہ کلام پاک کے مطالعہ کا اور کوئی مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ مطالعہ قرآن عبادت ہے اور عبادت کی شرط طہارت اور اخلاص نیت ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم سورۃ یٰسٓ کے مطالعہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

سورۂ یٰسٓ کے مختلف مضامین

اہلِ علم و معرفت سورۃ یٰسٓ کو قرآن کے قلب سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ تعبیر اس کے مضامین کی اہمیت کی نشاندہی کرتی ہے اس سورہ کے مضامین بنیادی طور پر انہیں تین موضوعات سے متعلق ہیں جو دین کے تین بڑے ستون ہیں یعنی توحید، نبوت اور قیامت، ان تین موضوعات کے تناظر میں اس سورے میں جن مضامین کو بیان کیا گیا ہے ان کے عنوانات یہ ہیں۔

(۱) انسان۔ اس کی تقویم اور تقدیر، مبداء اور معاد، نجات اور ہلاکت، جزا اور سزا

کا قانون۔

(۲) زندگی اور موت کی حقیقت اور ان کی مختلف کیفیتیں اور مختلف سطحیں۔

(۳) شہروں کی تباہی اور ان کے پس پردہ کام کرنے والے وہ عوامل جن کی نوعیت حادثاتی نہیں ہے بلکہ جو آفاقی اُصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۴) نظامِ فطرت میں تنظیم اور عدل، چاند، سورج اور دیگر اجرام فلکی کا مقررہ مدار پر گردش کرنا اور اپنی تقدیر سے انحراف نہ کرنا اور عالم تکوین کے ذرّہ ذرّہ کا ایک قانون کے تحت ہونا اور اس کا حساب رکھا جانا۔

(۵) انسان پر اللہ کے انعام، ہدایت، رحمت جس کی چند بنیادی مثالیں سمندروں کی تسخیر، جانوروں کی تسخیر، درخت سے آگ کا پیدا ہونا بھی ہیں۔

(۶) ہر شے کے ملکوت کا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہونا اور ہر شے کا اسی کی طرف رجوع کرنا۔

پہلا رکوع

زیرِ مطالعہ سورے میں پانچ رکوع ہیں۔ ہم ان میں سے ہر رکوع کے مضمون پر علیحدہ علیحدہ غور کریں گے اور پھر ان سب کو ملا کر سورۃ کے مضامین کا مطالعہ کریں گے۔

سورۃ یٰسین کے پہلے رکوع کا آغاز اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہوتا ہے۔ تمام ہدایت اللہ کی طرف سے ہے۔ رسولوں کی ترسیل بھی اسی کی طرف سے ہے اور کتابوں کی تنزیل بھی اسی کی طرف سے ہے وہی ہر شے کا مبدا بھی ہے اور معاد بھی ہے سورۃ کا اختتام بھی اللہ ہی کے ذکر پر ہوتا ہے۔ ہر شے کی ملکوت اسی کے ہاتھ میں ہے اور ہر شے اسی کی طرف رجوع کر رہی ہے۔

اس سورۃ کا آغاز ایک شخص اور ایک کتاب کے ذکر سے ہوتا ہے۔ دین اس شخص اور اس کتاب کی ہم آہنگی کا نکتہ ہے۔ شخص اور کتاب ایک ہی حقیقت کے

دو رُخ ہیں بلکہ زیادہ صحیح یہ بات ہے کہ یہ دونوں رُخ مل کر حقیقت کی ایک مکمل تصویر بناتے ہیں۔ دین راستہ دکھانے والی اور حکمت عطا کرنے والی ہدایت ہے۔ یہ ہدایت غفلت کو دُور کر کے شعور اور آگاہی عطا کرتی ہے وہ لوگ جو ہدایت سے محروم ہیں وہ غافلین ہیں اور غفلت کی کیفیت موت کی کیفیت ہے۔ ہدایت غفلت کو آگاہی یا موت کو زندگی سے بدلتی ہے۔ غفلت سکون اور آرام کی حالت ہے جو موت سے مماثل ہے۔ آگاہی بیداری اور زندگی کی علامت ہے جس کا لازمہ کرب اور جد وجہد ہے۔ کچھ لوگ اللہ کی ہدایت کو قبول کرتے ہیں۔ یہ مومن ہیں جنہیں اجرِ کریم کی بشارت دی گئی ہے، کچھ لوگ ہدایت کو رد کر کے کافر بن جاتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جنہیں اسفل اسافلین کی طرف رد کر دیا گیا ہے۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

پھر اس رکوع میں اللہ تعالیٰ اس بات کا اعادہ کرتا ہے کہ ہم موت میں سے زندگی نکالنے والے ہیں۔ موت میں سے زندگی نکالنے کی دونوں کیفیتیں ہیں یعنی غفلت سے آگاہی اور بیداری کی طرف لے جانا گویا موت میں سے زندگی کا برآمد کرنا ہے اور پھر قیامت میں مردوں کا زندہ کیا جانا بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے اور وہ بھی ان حقیقتوں سے آگاہی ہے جن سے انسان زندگی میں غافل تھا۔

پھر آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ تمام نقش قائم رہنے والے ہیں انہیں لکھا جا رہا ہے اور نہ صرف انسان کے اعمال لکھے جا رہے ہیں بلکہ اس کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کا حساب کتاب نہ کیا جا رہا ہو۔ اس کائنات کا نظام یہی ہے کہ یہاں ذرّہ ذرّہ کا شمار ہے، ہر شے کا حساب لکھا جا رہا ہے۔ اس کے مطابق جزا اور سزا دی جاتی ہے۔

دوسرا رکوع

دوسرے رکوع میں ایک تمثیل بیان کی گئی ہے، ایک قریہ کی تمثیل جس کی طرف رسول بھیجے گئے مگر لوگوں نے ان کی تکذیب کی جس کے نتیجہ میں وہ بستی عذاب کا شکار ہوئی۔ اس تمثیل کے ذریعے دعوتِ رسالت کی تصویر کشی کی گئی ہے اور رسالت کی حقیقت اور اہمیّت، رسولوں کی دعوت کی طرف لوگوں کے ردّ عمل اور ہدایت کے کفران کے نتیجہ میں اجتماعی زندگی کی تباہی کے آفاقی اصولوں کو بیان کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے یہ ہے کہ تمام ہدایت صرف اللہ کی طرف سے ہے۔ وہی اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے رسولوں کو مبعوث کرتا ہے۔ منصبِ رسالت اللہ کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے رسالت کے عہدے کے لئے چن لیتا ہے۔ کوئی شخص یہ عہدہ اپنی سعی و کوشش سے حاصل نہیں کر سکتا۔ رسالت اکتسابی عہدہ نہیں ہے۔ بلکہ وہبی منصب ہے۔ نہ کوئی شخص اپنی کوشش سے یہ عہدہ حاصل کر سکتا ہے اور نہ کوئی شخص جسے اللہ اس عہدے کے لئے منتخب کرتا ہے اس ذمّہ داری کو قبول کرنے سے انکار کر سکتا ہے۔ امر اور حکم اللہ ہی کی طرف سے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ رسول کی ذمّہ داری صرف پیغام پہنچانا ہے۔ اس کا نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں۔ رسول نتیجہ سے بے نیاز ہو کر لوگوں کو دعوتِ حق دیتا ہے۔ قرآن حکیم نے حضور کے حوالے سے بھی یہی کہا ہے کہ تمہارا کام صرف بلاغِ مبین ہے۔ اس تبلیغ کا نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے تم اس بارے میں تردد نہ کرو۔

پھر اس کے بعد دعوتِ رسالت کی طرف لوگوں کے ردّ عمل کا ذکر کیا گیا ہے، جب رسول ایک بستی میں گئے اور انہوں نے دعوتِ رسالت کا آغاز کیا تو لوگوں نے

رسول اوران کی رسالت دونوں کی تکذیب کی۔ اور اس تکذیب کی دلیل یہ دی کہ رسول ہم ہی جیسے بشر ہیں اس لئے ان پر اللہ کی طرف سے کوئی ہدایت نازل نہیں ہوئی۔ دعوتِ رسالت کی طرف لوگوں کا عموماً یہی رویہ ہوتا ہے جیسے تمثیل میں بیان کیا گیا خود حضورؐ کی تکذیب کرنے والوں نے یہ استدلال کیا کہ یہ تو ہمیں جیسے بشر ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں، بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں اور متاہلانہ زندگی گزارتے ہیں۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اپنی صداقت پر اللہ کی گواہی پیش کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ہم پر تو صرف بلاغ مبین کی ذمہ داری ہے۔ جو اس پیغام کو قبول کرتے ہیں اور جو اس پیغام کو رد کرتے ہیں وہ دونوں فریق اپنے اپنے عمل کا نتیجہ خود دیکھ لیں گے، یہ نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی ہماری رسالت کا سب سے بڑا گواہ ہے۔

پھر اس زبردست حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے کہ رسالت کی دعوت ہر معاشرے کے لئے حق اور عدل کی طرف انقلاب کی دعوت ہوتی ہے۔ رسول ہر معاشرے کے مروجہ اصولوں اور اداروں کے خلاف انقلابی دعوت دیتا ہے۔ اس دعوتِ انقلاب کے نتیجہ میں معاشرے میں ہیجان اور اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ معاشرے کے مراعات یافتہ اور طاقتور طبقوں کا مفاد اسی بات میں ہوتا ہے کہ معاشرہ اپنی قدیم وضع پر قائم رہے۔ اس لئے وہ معاشرتی زندگی میں پیدا ہونے والے اضطراب اور ہیجان کو نحوست سے تعبیر کرتے ہیں اور رسولوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ رسولوں کا طرزِ استدلال یہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں جو کچھ بھی ہلچل، ہیجان، کشمکش اور جدوجہد کی کیفیت ہے یہ خود تمہاری زیادتیوں کا نتیجہ ہے، یہ خود تمہارے ظلم کا ردِ عمل ہے۔

یہاں اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ رسالت کی دعوت کی لازمی شناخت یہ ہے کہ مراعات یافتہ اہل ثروت واقتدار کی طرف سے اس کی تکذیب کی جائے،

دعوتِ رسالت کی دوسری اہم اور بنیادی شناخت یہ ہے کہ یہ دعوت معاشرے کی مروجہ قدروں کے خلاف ایک زبردست انقلابی دعوت ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں معاشرے میں ہیجان، اضطراب، کشمکش اور مقاومت کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ جب معاشرہ انقلابی ہیجان کا شکار ہوتا ہے تو مختلف طبقوں کے ردِ عمل مختلف ہوتے ہیں۔ مراعات یافتہ طبقہ اسے رسولوں کی لائی ہوئی نحوست سے تعبیر کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ معاشرہ وضعِ قدیم پر قائم رہے تاکہ اس کی دولت، طاقت اور حیثیت میں فرق نہ آسکے مگر معاشرے کے مظلوم اور محروم طبقے اس انقلابی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور دوسروں کو بھی رسولوں کی تصدیق کی دعوت دیتے ہیں! اسی بات کو اس تمثیل میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے کہ اقصاءِ مدینہ سے ایک شخص آیا اور اس نے لوگوں سے کہا کہ اے میری قوم ان رسولوں کا اتباع کر۔ اقصاءِ مدینہ کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ شخص ایک ایسی آبادی کا رہنے والا تھا جہاں محروم اور مسکین لوگ بستے ہیں اس شخص نے رسولوں کی صداقت کے لئے دو باتوں کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ رسول تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے، ان کا کسی طرح کا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے دوسری بات یہ کہ یہ خود ہدایت یافتہ ہیں ان کی ذاتی زندگی برائیوں سے پاک اور نیکیوں کا مرقع ہے۔ یہی دو باتیں رسالت کی بنیادی شرائط ہیں۔ حرفِ حق کی تبلیغ وہی کر سکتا ہے جس میں بے نیازی کی شان ہو اور جس کی اپنی زندگی بے داغ ہو حضورؐ نے بھی اپنی قبلِ بعثت کی پاکیزہ زندگی کو اپنی رسالت کی گواہی کے طور پر پیش کیا ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ انسان رسولوں پر ایمان کے نتیجہ میں حق اور باطل میں تمیز کرنے کا شعور حاصل کر لیتا ہے۔ اب وہ اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اس کا حقیقی اور واحد معبود صرف وہی اللہ ہے جس نے اس کو خلق کیا جو اس کی

ہدایت کرتا ہے جس کی ہدایت اس کے لیے نفع کا سبب ہے اور جس کی ہدایت کا انکار کر کے انسان خود اپنے نقصان کو دعوت دیتا ہے۔ انسانوں کے نفع اور نقصان پر اس کے علاوہ اور کوئی قادر نہیں ہے اس لیے اس کے لیے علاوہ اور کوئی پرستش کے لائق نہیں ہے۔ وہ بُت جنہیں خدا کے علاوہ لوگوں نے اپنا معبود بنا رکھا ہے وہ گونگے اور بہرے ہیں۔ وہ نہ ہدایت کر سکتے ہیں جس کے ذریعہ لوگوں کو فائدہ پہنچ سکے اور نہ وہ خدائے رحمٰن کے غضب سے لوگوں کو بچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس شعور و آگاہی اور اس ایمان کے نتیجہ میں انسان کو ایک نئی زندگی حاصل ہوتی ہے اور وہ انسانیت اور زندگی کی ایک بلند سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ لوگ جو غفلت اور پستی کا شکار ہیں وہ اس کی زندگی کی اس نئی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ مگر وہ شخص جسے اس کے رب نے انعام سے نوازا ہے اپنی قوم کی پستی اور غفلت کی کیفیت سے واقف ہے وہ اس کیفیت پر کڑھتا ہے اور کہتا ہے اے کاش یہ بھی میری طرح اس نئی زندگی میں داخل ہو سکتے۔ مگر جو لوگ اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت سے روگردانی کرتے ہیں وہ نہ صرف انعام سے محروم رہتے ہیں بلکہ اللہ کے عذاب کو دعوت دیتے ہیں۔ ہدایت سے انکار کا لازمی نتیجہ عذاب ہے، ہر وہ قوم جو ہدایت کا انکار کرتی ہے وہ جلد یا بدیر تباہی کا شکار ہوتی ہے، اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہدایت زندگی کی علامت ہے اور کسی قوم کی زندگی کی واحد ضمانت یہ ہے کہ اس ہدایت کو قبول کر کے اس پر عمل کرے۔ قوموں کی تباہی کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ یہ وہ آفاقی قانون ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک جاری رہے گا، کوئی قوم اس قانون کی زد سے بچ نہیں سکتی۔ وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں وہ اپنی تباہی کے محضر پر خود دستخط کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو رحمان اور رحیم ہے۔ اپنی رحمت اور محبت کے باوجود عذاب نازل کرتا ہے اس لیے کہ یہی اس کے عدل کا تقاضا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ وہ بندوں کی حالت پر افسوس کرتا ہے

کہ انہیں کیا ہوگیا ہے جب ان کی طرف کوئی رسول بھیجا جاتا ہے تو یہ اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ یہ ماضی کی تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔ یہ اس بات کو نہیں دیکھتے کہ کتنی ہی بستیاں اپنے کفر کی وجہ سے عذاب کا شکار ہوگئیں۔ ان میں بسنے والوں کا اب کوئی نام ونشان تک باقی نہیں ہے۔ یہ عدلِ الٰہی کے اس قانون سے کوئی عبرت اور نصیحت حاصل نہیں کرتے کہ حق سے روگردانی اور ظلم و بغی پر اصرار دُنیا و عاقبت میں تباہی ہے۔

تیسرا رکوع

تیسرے رکوع کے شروع میں مردہ زمین کے زندہ ہونے کی تمثیل بیان کی گئی ہے، یہ گویا موت میں سے زندگی کے برآمد ہونے کی کیفیت ہے، موت اور زندگی کا ذکر اس سورت میں مسلسل چل رہا ہے۔ پہلے رکوع میں یہ کہا گیا کہ اللہ موت میں سے زندگی برآمد کرنے والا ہے، دوسرے رکوع میں قوموں کی زندگی اور موت کا قانون اور مومن کی زندگی کی نئی اور بلند حالت کا ذکر کیا گیا اور تیسرے رکوع کے آغاز میں یہ بتایا گیا کہ زمین کا مُردہ ہونے کے بعد زندہ ہونا اللہ تعالیٰ کی ایک آیت ہے، انسان کو موت کی حالت سے زندہ کیا گیا ہے اور اس زندگی کی مدت کے تمام ہونے کے بعد اسے دوبارہ مُردہ حالت سے زندہ حالت میں تبدیل کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی یہی شان ہے کہ وہ موت میں سے زندگی کو برآمد کرنے والا ہے۔ اس نے زمین کو جب کہ وہ مُردہ تھی زندہ کیا، اس میں نخل اُگائے جن کے پھل انسانی زندگی کو قائم رکھتے ہیں اس نے نہریں بہائیں جن کے پانی پر ہر شے کی زندگی کا دارو مدار ہے۔ یہ سب انسان کے لئے متاعِ حیوٰۃ ہے اور یہ متاعِ حیات اللہ تعالیٰ کا انعام ہے جن کے ذریعہ زندگی کو قائم رکھا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد زندگی کی بقا اور تسلسل کا قانون بیان کیا جارہا ہے، یہ صرف اللہ تعالیٰ

کی شان ہے کہ وہ احد ہے اور اس کا کوئی کفو نہیں ہے۔ جہاں تک مخلوقات کا تعلق ہے انہیں زوج یعنی جوڑوں کی صورت میں خلق کیا گیا ہے کہ اسی طرح وہ اپنی زندگی کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ یہ بقائے حیات کا قانون بھی اللہ کی رحمت اور حکمت کا آئینہ دار ہے۔

زندگی کے ظہور، قیام اور بقاء کے قوانین کے بعد اس ماحول کا ذکر کیا گیا ہے جو ماحول انسان کو فراہم کیا گیا ہے۔ یہ ماحول کس قدر حسین اور منظم ہے، یہاں ہر شے ایک قانون کے تابع ہے اور کسی میں اس قانون سے انحراف کی مجال نہیں ہے۔ رات اور دن کا اختلاف اللہ کی نشانی ہے، اسی طرح چاند سورج اور دوسرے اجرام فلکی کا اپنے اپنے مقررہ مدار پر گردش کرنا اللہ کی نشانی ہے۔ ہر طرف تنظیم ہے، حُسن ہے اور ہر شے قاعدہ اور قانون کی پابند ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنے خصوصی انعامات کا ذکر کیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے انسانوں کو وہ سواریاں عطا کیں جن کے ذریعے وہ سمندروں میں سفر کر سکتا ہے، اس سورۂ مبارکہ میں انسانیت کی تہذیبی ترقی کے عوامل کی بڑی بلیغ نشاندہی کی ہے، انسان کے تہذیبی ترقی کے سفر میں تین باتیں بُنیادی اہمیت رکھتی ہیں یعنی آگ کی دریافت، جانوروں کی تسخیر اور ان کو خود سے مانوس کرنا اور سمندری اور فضائی راستوں کی تسخیر، ان تینوں باتوں کو اللہ نے اپنی رحمت سے تعبیر کیا ہے۔ یہ انسانیت کا اعزاز و اکرام ہے۔

زندگی کی نمود، زندگی کے قیام و دوام کے قانون اور زندگی ماحول اور زندگی کی ترقی کے وسائل کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس قانون کو بیان کیا ہے جو زندگی گزارنے کا قانون ہے جس قانون پر عمل کر کے انسان حقیقی اور پائیدار زندگی حاصل کر سکتا ہے اور وہ قانون ہے تقویٰ اور اطعام مسکین کا قانون، تقویٰ فرد کی زندگی کے تزکیہ اور تکمیل اور نجات اور فلاح کی ضمانت ہے اور اطعام مسکین معاشرتی زندگی کی فلاح اور استحکام کا اصول

ہے اور اس قانون کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ صرف آثارِ گذشتگان پر غور اور آیاتِ الٰہی پر تفکّر کر کے انسان اس حقیقت کو دریافت کر سکتا ہے کہ انہی اصولوں پر عمل کر کے زندگی کو پائیداری اور استحکام بخشا جا سکتا ہے ورنہ یہ زندگی اور اس کی تمام لذتیں اور راحتیں ایک دھوکا اور فریب ہیں۔ یہ دُنیا بڑی منظم مگر حقیقتاً بڑی ناپائیدار ہے۔ انسان بظاہر بڑا طاقتور مگر درحقیقت نہایت کمزور ہے، زندگی اور اس کا سب کھیل آنِ واحد میں ختم ہو جاتا ہے۔ ایک جھنگھاڑ ہر شے کو درہم اور برہم کر دیتی ہے اور پھر انسان کو اس بات کا موقع بھی نہیں مل سکتا کہ وہ ان لوگوں سے وصیت تک کر سکے جن کے سبب وہ دُنیاوی زندگی کے بکھیڑوں میں اُلجھ کر اپنی زندگی کی حقیقت اور اس کے مقصد سے غافل ہو گیا تھا۔ وہ اپنی موت کو بھول گیا تھا۔ وہ معاد اور جزا اور سزا کے قانون کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ اب ایک یہ جھنگھاڑ آنِ واحد میں تمام حجابات کو اُٹھا دیتی ہے اور انسان جن حقیقتوں سے روگردانی کر رہا تھا وہ اس کے سامنے پوری طرح بے نقاب ہو جاتی ہیں۔

چوتھا رکوع

چوتھے رکوع میں زندگی کی ایک دوسری سطح کا ذکر ہے جسے حیات بعد الموت کہتے ہیں۔ اس میں قیامت کی منظر کشی کی گئی ہے۔ جب صور پھونکا جائے گا تو مُردے اپنی قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس سورۂ مبارکہ میں آوازوں کا زندگی اور موت کا ساتھ ایک عجیب تعلق بیان کیا گیا ہے۔ اس سے قبل ہم نے یہ مطالعہ کیا کہ قومیں اور افراد ایک چنگھاڑ کے نتیجہ میں موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہاں اس کے برعکس یہ بتایا گیا ہے کہ صور کی آواز مُردوں کو زندہ کر دے گی۔ انہیں خوابِ غفلت سے چونکا دے گی اور لوگ اس کرب کو محسوس کریں گے جو بیداری اور زندگی کا کرب ہے۔ اور جب لوگ

اس بات پر حیرت کا اظہار کریں گے کہ انہیں موت کی نیند سے کس نے جوںکا دیا تو ان سے کہا جائے گا کہ یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ یوم معاد ہے، آج تم خود دیکھ لوگے کہ پیغمبروں نے جو کہا تھا وہ بالکل سچ ہے آج مخفی حقیقتیں ظاہر ہو جائیں گی، تمام حجابات اُٹھ جائیں گے اور انسان نے جیسا کچھ عمل کیا ہے اسے خود دیکھ لے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے قانونِ عدل کو بیان کیا جا رہا ہے کہ اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا بلکہ ہر شخص کو ٹھیک اس کے عمل کے مطابق جزا اور سزا دی جائیگی۔ قیامت کا دن وہ ہے جب حق اور باطل کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کر دیا جائے گا۔ دُنیا کی زندگی میں حق اور باطل باہم مخلوط ہیں انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی لیکن قیامت کا دن چونکہ حساب کتاب اور جزا اور سزا کا دن ہے اس لئے اس دن حق اور باطل جُدا جُدا کر دیئے جائیں گے اور ہر شخص اپنے صحیح محل اور مقام پر پہنچ جائے گا گویا مکمل طور پر عدل کی کیفیت قائم ہو جائے گی۔

اہلِ ایمان کو جنّت کا انعام دیا جائے گا اور جنّت کی کیفیت یہ ہوگی کہ یہاں انسان کی ہر تمنّا پُوری ہو گی۔ یہاں اسے ہر طرح کی مسرّت حاصل ہو گی اور یہاں وہ مکمل اطمینان اور سکون کی حالت میں ہو گا۔ جنّت میں انسان کی فطرت اس قدر پاکیزہ اور لطیف ہو جائے گی کہ وہ کسی ناشائستہ بات کی آرزو نہیں کرے گا اسے ہر طرح کا پاکیزہ رزق حاصل ہو گا اور اس کی مسرّت کی تکمیل کے لئے اسے پاکیزہ ساتھی عطا کئے جائیں گے۔ یہ زندگی کی وہ کیفیت ہو گی جہاں انسان مکمل آسودگی، سکون اور اطمینان محسوس کرے گا۔ اس کیفیت کو سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اطمینانِ نفس کی یہ کیفیت جسے جنّت کی خصوصیت بنایا گیا ہے۔ یہ خاصانِ خدا کو اس دُنیاوی زندگی میں بھی حاصل ہوتی ہے کوئی بڑے سے بڑا حادثہ ان کے اطمینان اور سکون کو مُتاثر نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ جب وہ کربلا کے میدانِ امتحان میں بھی

کھڑے ہوں تو بھی ان کے دل سے سَلٰمٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِیْمٍ کی آواز آتی رہتی ہے۔

اہلِ جنّت کے ذکر کے بعد اہلِ جہنّم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ وہ مجرم بندے ہیں جنھوں نے اپنے رب کی ہدایت کا انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجّت پوری کی جارہی ہے انہیں یہ یاد دلایا جارہا ہے کہ تم سے شیطان کی پیروی نہ کرنے کا عہد لیا گیا۔ تمہیں یہ بتادیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ تمہیں راہِ مستقیم کی ہدایت کی گئی تھی۔ مگر تم نے عقل و شعور سے کام نہیں لیا۔ تم گمراہی میں بھٹکتے رہے۔ اب تمہارا ٹھکانہ جہنّم ہے، اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک ہے کہ وہ اپنے بندوں پر ظلم کرے۔ اہلِ جہنّم نے خود اپنے عمل سے اپنے لئے جہنّم کمایا ہے اس دن ان کے مُنہ پر مہر ہوگی نگران کے ہاتھ اور پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ مطلب یہ کہ قیامت کی میزان میں ایمان کے زبانی دعویٰ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس دن اس دعویٰ کی عملی شہادت طلب کی جائے گی، انسان کے ہاتھ اس بات کی گواہی دیں گے کہ اس کا دوسروں کے ساتھ طرزِ عمل کیسا تھا اور انسان کے پاؤں اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ کس راستہ پر چلا، ہدایت کے راستہ پر یا گمراہی کے راستہ پر۔ انسان کے اعضا اس بات کی گواہی دیں گے کہ اس نے اپنے لئے جہنّم کسب کیا ہے، اس طرح اللہ کا وعدہ پورا ہوگا، انصاف کے تقاضے پورے ہوں گے اور بدکار جہنّم میں داخل ہو جائیں گے، پھر اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آنکھیں دی تھیں تاکہ وہ حق اور باطل کو پہچان سکے، اسے قوت و استقامت دی تھی تاکہ وہ راہِ حق میں جدوجہد کرسکے مگر اس نے اپنی بصیرت اور استطاعت کا صحیح استعمال نہیں کیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کفران کیا۔

پانچواں رکوع

پانچویں رکوع کے آغاز میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو حقیقی طاقتیں حاصل ہیں وہ اس کی اپنی نہیں ہیں بلکہ سب اللہ تعالیٰ کا انعام اور اس کی امانت ہیں اور اللہ تعالیٰ جسے طولِ عمر عطا کرتا ہے اسے اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ بچہ ہر طرح ناتواں اور ضعیف ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ انسان کی صلاحیتیں ترقی کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ شباب کا زمانہ آتا ہے جب انسان کی تمام طاقتیں اپنے کمال پر ہوتی ہے۔ مگر شباب کے بعد شیب زندگی کا قانون ہے اور بڑھاپے کی ایک وہ حالت بھی آتی ہے جب تمام طاقتیں انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ اعضا مضمحل، حواس معطل اور شعور مُردہ ہو جاتا ہے، حُسن، شباب، طاقت اور صحت سب کچھ رخصت ہو جاتا ہے اور انسان بچپن کی حالت کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے۔ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ انسان کی تمام طاقتیں اس کی اپنی ملکیت نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں۔ رسالت اللہ تعالیٰ کی عظیم امانت اور رحمت ہے۔ عرب رسولؐ کی باتوں کو شاعری سے تعبیر کرتے تھے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ رسولؐ کی شان شاعری سے بہت بلند ہے۔ رسولؐ حقیقت کے علاوہ کچھ نہیں کہتا اس کا پیغام حقیقت کا استحضار ہے۔ یہ ذکر ہے اور یہ قرآنِ مُبین ہے۔ یہ حقیقت کا کھلا ہوا بیان ہے لیکن اس سے وہی لوگ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جو زندہ ہوں یعنی جن کے قلوب مردہ نہ ہوں۔ یہاں زندگی کی اس کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے جو قلب و ضمیر کی بیداری سے عبارت ہے۔ جن لوگوں کے دل زندہ ہیں وہ رسولؐ کے پیغام سے نصیحت حاصل کرتے ہیں اور وہی اس بات کو سمجھتے ہیں کہ اس کائنات میں رسول اور رسول کی ہدایت کا مرتبہ و مقام کیا ہے اور اس مرتبہ و مقام کے تقاضے اور اس کی ذمہ داریاں کس طرح پوری کی جا سکتی ہیں۔

انسان اپنے مقام اور فرض کو پہچاننے کے لئے اور اللہ تعالیٰ کے احسان و انعام کا کچھ ادراک کرنے کے لئے غور کرے کہ اللہ نے چوپایوں کو پیدا کیا اور انسان کو ان کا مالک بنا دیا کہ اب وہ طرح طرح سے نفع رسانی میں اس کے کام آتے ہیں، نقل و حرکت میں بار برداری میں غذا بہم پہنچانے میں، اور بہت سے کاموں میں، تاریخی اعتبار سے جانوروں کا مسخر ہو کر انسان کی تحویل میں آنا انسانی تہذیب کے ارتقا میں ایک نئے انقلاب آفریں دور کا آغاز تھا۔ اِدھر اللہ تعالیٰ کا بندوں پر یہ کرم و اکرام ہے، اُدھر انسان بجائے اپنے نفس اور اپنے خدا کی معرفت حاصل کرنے کے کہ یہی اللہ کے انعام کا شکر ہے اپنے آپ کو اتنا ذلیل کرتا ہے کہ وہ بجائے خدا پر بھروسہ کرنے کے اور اسی کی عبادت کرنے کے اپنے وہم کے بت شجر و حجر کے بت، دولت اور اقتدار کے بت اس اُمید میں کھڑے کر لیتا ہے کہ وہ ضرورت کے وقت اس کی مدد کریں گے۔ بھلا وہ کیا مدد کرینگے وہ تو خود محتاجِ مطلق ہیں، بس اتنا ہوا کہ انسان نے اپنے آپ کو ذلیل کر کے بندگانِ خدا کی فہرست سے اپنا نام خارج کروا کر بندگانِ صنم کی فہرست میں اپنا نام لکھوالیا۔ وہ انسان جس نے خود اپنے آپ کو ہیچ و پوچ ذلیل کر لیا ہو اس کی باتوں کی کوئی وقعت نہیں ہے وہ اور اس کے خدا دونوں ہیچ و پوچ ہیں تو اس لئے رسولؐ سے کہا جا رہا ہے کہ وہ ان کے ایذا پہنچانے اور مخالفت کرنے یا مذاق اُڑانے سے آزردہ نہ ہو اللہ ان سب باتوں کو جانتا ہے جن کو یہ چھپاتے ہیں یا جنھیں یہ ظاہر کرتے ہیں اور اس کا جاننا کافی ہے۔ رسولؐ کا کام اللہ کا پیغام پہنچانا ہے، مخالفوں سے نمٹنا اللہ کا کام ہے۔

اس کے بعد پھر انسان کی حقیقت اور سرکشی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت کی شان ہے کہ اس نے انسان کو جس کی ابتدا نہایت حقیر ہے یہ آزادی اور اختیار بھی دیا کہ اگر وہ چاہے تو اس کا کھلا ہوا دشمن بن جائے کیونکہ

اللہ تعالیٰ اپنی طاقت کے زوال کے خوف سے بے نیاز ہے انسان کو مجازی اختیار دینے سے اس کے مطلق اختیار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ادھر انسان ہے کہ اللہ کے متعلق تو مثل گھڑتا ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا اپنے متعلق نہیں سوچتا۔ وہ ایک ناچیز قطرہ کی حالت سے اس حالت تک کیسے آگیا کہ آج خدا کی مخالفت کر رہا ہے جس طرح اس نے انسان کو پہلی بار مُردہ حالت سے زندہ کیا اسی طرح وہ دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ انسان اپنی خلقت کو بھول جاتا ہے وہ اس کارخانۂ قدرت کی تخلیق کو نظر انداز کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ شجر سے آگ برآمد کرتا ہے (واضح رہے کہ آگ کی دریافت انسانی تہذیب کے ارتقا کا سب سے اہم موڑ ہے)۔ یعنی وہ ایک شے سے دوسری بالکل مختلف شے پیدا کر دیتا ہے تو پھر اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ جس طرح اس نے انسان کو پہلی بار خلق کیا۔ اسی طرح اسے موت کے بعد دوبارہ زندہ کرے۔ وہ خلاق عظیم ہے۔ تخلیق اس کے ظہور کی شان ہے اور وہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ جس طرح چاہے جس کیفیت میں چاہے اپنی اس شان کو نمایاں کرے۔ اس کارخانۂ قدرت کو چلانے والی تمام قوتیں اسی کے ہاتھ میں ہیں اور اسی کی طرف ہر شے رجوع کر رہی ہے۔

پہلا رکوع

حروفِ مقطعات

اس سورۂ مبارکہ کی ابتداء دو حروف سے ہوتی ہے یا (ی) اور سین (س)۔
یہ حروفِ مقطعات ہیں۔ حروفِ مقطعات وہ ہیں جن کا تلفّظ قطع کر کے کیا جاتا ہے، کلامِ پاک کی بعض دیگر سورتوں کا آغاز بھی حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے۔ پورے کلامِ پاک میں ایسے حروفِ مقطعات کی تعداد ۱۴ ہے۔

علمائے تفسیر نے حروفِ مقطعات کے بارے میں مختلف اور کثیر آراء پیش کی ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ حروف اپنے متعلقہ سورے کا عنوان ہیں۔ اس کے مضامین کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ حروفِ مقطعات اسماء وصفاتِ الٰہی کا مظہر ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حرفِ ندا ہیں جن کے ذریعے لوگوں کو کلامِ الٰہی کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک یہ حروف اسرار ہیں جن کے بھید سے صرف اللہ، اس کا رسول ﷺ یا وہ صاحبانِ علم واقف ہیں جنہیں اس کا علم دیا گیا ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلامِ پاک وہ معروضی حقیقت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلّی کو کلام کے ذریعے ظاہر کیا ہے اور چونکہ یہ کلام تجلّیٔ الٰہی کا مظہر ہے اس لئے یہ مقدس ہے اور چونکہ یہ کلام الفاظ اور حروف سے عبارت ہے اس لئے اس کا ہر لفظ اور ہر حرف مقدس اور پاکیزہ ہے، ہر حرف اور ہر لفظ اس تجلّیٔ الٰہی کا مظہر ہے جس کی حقیقت ناقابلِ بیان اور ناقابلِ محیط ہے۔ حروفِ مقطعات اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس طرح انسانوں کو قرآن میں مسلسل تفکر اور تعقل کی دعوت

دیتے ہیں۔ انسان جس حد تک حقیقتِ قرآنی کا شعور حاصل کرتا ہے اس حقیقت کے لامحدود اور ناقابلِ محیط ہونے کا شعور اسی حد تک بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ان ہی حروف کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے جو انسان اپنی عام بول چال میں استعمال کرتا ہے جس طرح قدرت کے تمام عجائبات یہاں تک کہ انسان بھی مٹی ہی سے بنے ہیں۔ صحیفۂ آسمانی حروف کی مختلف علامتوں میں ظاہر ہوتا ہے جس طرح صحیفۂ فطرت مٹی کی مختلف صورتوں پر مشتمل ہے۔

ایک غور طلب بات یہ ہے کہ کلامِ پاک میں حروفِ مقطعات جہاں استعمال ہوئے ہیں وہیں قرآن کی عظمت کے کسی پہلو کی طرف توجہ مبذول کی گئی ہے۔

یٰسٓ ①

سُورۂ یٰسین کے حروف کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہاں یا حرفِ ندا ہے اور سین سے مُراد اِنسان ہے اور انسان سے اشارہ ہے اِنسانِ کامل کی طرف، "یا اِنسان یا اِنسانِ کامل"۔ امام محمد باقر علیہ السّلام سے ایک روایت ہے کہ یٰسین حضورؐ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔

وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ②

وَ قسم کے لئے ہے۔ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ کا مطلب یہ ہوا کہ قسم ہے قرآنِ حکیم کی۔ بعض علماء کے نزدیک وَ حرفِ عطف ہے۔ اس لحاظ سے مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہدایت کے دونوں وسیلوں یعنی قرآن اور پیغمبرؐ کے متعلق یا اور سین کی قسم کھا رہا ہے۔

قرآن اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جس کے ذریعہ اس نے اپنی تجلّی کو حروف و الفاظ کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تجلّی کے ظہور کی مختلف شانیں ہیں۔ یہ تجلّی اس کائنات میں بھی ظاہر ہے اور اس تجلّی کا ظہور انسان کے قلب پر ایسی کیفیت میں بھی ہوتا ہے جو لفظ و بیان کے وسیلہ سے بے نیاز اور ماوراء ہے۔ لیکن قرآن عربی میں نازل کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں تجلیٔ الٰہی کا ظہور زبان کے وسیلہ سے ہوا ہے تاکہ اِنسان کے لئے

یہ تجلی زیادہ سے زیادہ منکشف ہو سکے۔ یہ ہدایت کا واضح اور کھلا ہوا بیان ہے۔ یہ قرآن پُراز حکمت ہے اسی لئے بار بار قرآن کے لئے حکیم کی صفت استعمال ہوئی ہے۔

حکیم کے معنی ہیں محکم قایم، استوار، پائیدار، ہمیشہ باقی رہنے والی شے انجیل میں حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا کہ زمین کے پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتے ہیں لیکن اللہ کے کلام کا کوئی نکتہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹ سکتا۔

حکیم کے معنی یہ بھی ہیں کہ یہ کلام ہر طرح کے نقص سے پاک ہے اور یہ حق کا حکم کرنے والا ہے۔

حکمت حقائق المعارف سے عبارت ہے جس میں حقیقت، شریعت، طریقت، موعظہ، حُسنِ اخلاق، تزکیہ نفس، تدبیر منزل، سیاست مدن سبھی کچھ شامل ہے۔

سید قطب نے اس لطیف نکتہ کی طرف اشارا کیا ہے کہ حکیم عاقل کی صفت ہے۔ قرآن بظاہر ایک کتاب ہے۔ اس کو کتابِ حکمت کہا جا سکتا تھا لیکن قرآن کے لئے حکیم کی صفت استعمال کر کے گویا اس طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ قرآن ایک معروضی حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زندہ حقیقت ہے۔ یہ قرآن قرآن حکیم ہے۔

جناب امیرؑ نے نہج البلاغۃ کے ایک خطبہ میں قرآن کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ "یہ ایسا رہنما ہے جو کبھی گمراہ نہیں کرتا، ایسا سخن گو ہے کہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا پھر اسی خطبہ میں آگے چل کر آپؑ نے فرمایا اور جان لو کہ بروزِ قیامت قرآن وہ شافع ہے کہ جس کی شفاعت قبول ہو گی اور وہ ایسا سخن گو ہو گا کہ اس کی گفتار مصدق ہو گی۔" اس خطبہ میں قرآن کو ناصح، ہادی، ہم جلیس، شفا دینے والا اور شفاعت کرنے والا بتایا گیا ہے۔ یہ گویا قرآنِ ناطق کی زبان سے قرآنِ صامت کے ایک زندہ حقیقت ہونے کا اعلان ہے۔

گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کا حکیم ہونا اس کے سچے اور مُنزّل من اللہ ہونے پر دلیل ہے اور خود قرآنِ حکیم حضورؐ کے سچے رسول ہونے پر دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ

قرآنِ حکیم کی قسم کھا کر یہ گواہی دے رہا ہے کہ اس کا رسول سچّا ہے۔ قرآن حکیم رسولؐ کے سچا ہونے پر اللہ کی گواہی ہے۔

إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٣﴾

(بے شک تم ان میں سے ہو جنہیں بھیجا گیا ہے)گویا ہدایت اللہ تعالیٰ کی سُنّت ہے۔ ہدایت ہی اللہ اور بت کا فرق ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے رسولوں کو بھیجتا رہا ہے اس لئے حضورؐ کی بعثت کوئی انہونی یا تعجب انگیز بات نہیں بلکہ یہ ترسیلِ انبیاء کی شاندار روایت کی آخری کڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے رسول بھیجتا رہا ہے مگر لوگوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ رسولوں کی تکذیب کرتے رہے ہیں۔ وہ رسولوں کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ تو ہمیں جیسے بشر ہیں اور ان پر کوئی پیغام نازل نہیں ہوا کلام پاک عام انسانوں اور رسولوں کا ذکر مختلف انداز سے کرتا ہے۔ انسانوں کی تو خلقت کا ذکر کیا گیا ہے لیکن انبیاء کی خلقت کا نہیں بعثت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ذکر کی یہ دو مختلف سطحیں ہی عام انسانوں اور رسولوں کی حیثیت کو ممیز کر دیتی ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ رسولؐ کی تکذیب تو عام انسانوں کی طرف سے کی جا رہی ہے مگر اس کے جواب میں خطاب تکذیب کرنے والوں سے نہیں ہے بلکہ خود رسولؐ کو مخاطب کر کے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم مرسلین میں سے ہو۔ گویا اللہ اور اسکے رسولؐ کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ اللہ اپنے رسولؐ کے بارے میں تکذیب کرنے والوں سے جدل یا مناظرہ کرے۔ یہ جدل اور مناقشہ کا مقام نہیں ہے۔ اللہ کی گواہی اپنے عبد کی سچائی کے لئے کافی ہے۔ کارِ رسالت کے آغاز پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ کارِ رسالت کی تکمیل پر بندے اپنے اللہ کے سامنے رسولؐ کے سچا ہونے پر گواہی دینگے۔

عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٤﴾

صراطِ مستقیم سے مُراد ہے سیدھا راستہ، وہ راستہ جو مستقیم اور پائیدار اور استوار ہے،

جس میں کوئی شک، کوئی تردّد، کوئی کجی، کوئی کمزوری، کوئی انحراف یا التواء نہیں ہے، بلکہ یہ وہ راستہ ہے جو ہر دور میں ہر اس شخص کے لئے کھلا ہوا ہے جو ہدایت کا متلاشی ہو۔

جناب طباطبائی فرماتے ہیں کہ یہاں الصراط یعنی معرفہ استعمال نہیں ہوا بلکہ صراط نکرہ کے طور پر استعمال ہوا ہے جس سے اس راستہ کی عظمت ظاہر ہوتی ہے وہ طریق جو سالک کو اللہ تعالیٰ تک یعنی کمالِ عبودیت اور قرب کی سعادتِ انسانی تک پہنچانے والی ہے۔

صراط اور سبیل ہم معنی لفظ ہیں لیکن کلام پاک میں ان کے معنوں کی سطحیں مختلف ہیں۔ اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ الحق حقیقتِ واحدہ ہے مگر اس تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں۔ شریعتیں مختلف ہیں (شریعت شرع سے ہے اور شرع کے معنی ہیں راستہ)۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ایک ہی دین میں ہر فرد کا دینی تجربہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ جو لوگ اللہ کی معرفت کی جدوجہد کرتے ہیں اللہ ان کے لئے معرفت کی سبیلیں کھول دیتا ہے۔ کلام پاک میں سبیل کے لئے جمع کا صیغہ یعنی سُبُلَنَا استعمال ہُوا ہے مگر صراط کے لئے ہمیشہ واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ گویا سبیلیں مختلف ہیں مگر صراط مُستقیم ایک ہی ہے۔ صراط وہ حق ہے جو معرفت کی ہر سبیل میں موجود مگر اس سے بلند ہے صراط کی نسبت اللہ کی طرف ہے اور سبیل کی نسبت مختلف شرائع یا سالک کی طرف ہے پیغمبروں کی شریعتیں مختلف ہیں مگر صراط ایک ہی ہے۔ تمام پیغمبر صراطِ مستقیم پر ہیں۔

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۵﴾

(وہ بڑے رحمت والے اور عزت والے خدا کا نازل کیا ہُوا)

لفظ تنزیل کے معنی ہیں نازل ہونا، کسی چیز کا بلندی سے پستی کی طرف اُترنا۔ اس میں یہ اشارا ہے کہ تمام ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی ہے صرف اسی

میں یہ طاقت ہے کہ وہ اپنے بندوں کی ہدایت کرے اور اس کی ہدایت اس کی رحمت کی شکل میں نازل ہوتی ہے۔

عزیز اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنہ میں سے ایک اسم ہے جو اس کی طاقت، سلطان اور عزّت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

کلام پاک میں لفظ عزیز اللہ کے لئے مفرد طور پر استعمال نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ کسی صفت کے ساتھ مرکب ہو کر استعمال ہُوا ہے جیسے عزیزٌ ذوی انتقام، عزیز الحکیم، عزیز الرّحیم۔

جہاں عزیز کے ساتھ ذوی انتقام کہا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طاقت اور جبروت کی اس شان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بندوں کے اعمال کے حساب کتاب اور ثواب عتاب سے متعلق ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ بندوں کو ان کی بداعمالیوں کی سزا دے اور اس کی قدرت کی شان یہ ہے کہ کوئی شخص نہ اس کے فیصلے سے مفر کرسکتا ہے اور نہ اس کے انتقام سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

جہاں العزیز الحکیم کہا گیا ہے وہاں عالم تکوین و تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی اس قدرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو سراسر حکمت پر مبنی ہے۔

جہاں العزیز الرّحیم کہا گیا ہے وہ اس کی طاقت کی وہ شان ظاہر کی گئی ہے جو رحمت سے عبارت ہے، ہدایت کا نازل ہونا اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی رحمت کی شان ہے۔ ترسیل و تنزیل سے اس کا نفع مقصود نہیں ہے، اتباع کرنے والوں کیلئے سعادت اور کمال ہے۔

اس سورۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے باب میں کتاب کا ذکر بھی ہے اور پیغمبر کا ذکر بھی ہے اور کتاب اور حامل کتاب کا ذکر بار بار ہے اور ساتھ ساتھ ہے اور اسے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

جناب طباطبائی کا فرمانا ہے کہ العزیز الرّحیم اللہ تعالیٰ کی شان بھی ہے اور اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب کی شان بھی ہے۔ اللہ بھی العزیز الرّحیم ہے، اس کی کتاب بھی العزیز الرّحیم اور اس کا رسول بھی العزیز الرّحیم ہے۔ رسول لوگوں کے لئے اللہ کی رحمت ہے اور چونکہ وہ اس اللہ کا بھیجا ہوا ہے جو العزیز الرّحیم ہے اس لئے اس کے پاس بھی سلطان ہے، طاقت ہے، اتھارٹی (AUTHORITY) ہے وہ بڑی عزّت والا ہے، اسے کسی حال میں اس عزّت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ اسے صلیب کی طرف لے جایا جا رہا ہو لوگ اس پر طعن و طنز کے تیر برسا رہے ہوں اور اپنے خیالِ خام میں اسے بے عزّت کر رہے ہوں مگر وہ صاحبِ عزت و رحمت ہے، وہ بندگانِ خدا جو کارِ رسالت میں شریک ہیں خواہ وہ میدانِ کربلا میں بے یار و مددگار کھڑے ہوں یا کسی دربار میں طوق و سلاسل میں پابند نظر آئیں مگر وہ صاحبانِ عزّت و وقار ہیں۔ انہیں اس عزّت سے محروم نہیں کیا جا سکتا جو انہیں اس خدا کی طرف سے عطا ہوئی ہے جو العزیز الرحیم ہے۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۶﴾

(تاکہ تم ان لوگوں کو ڈراؤ جن کے باپ دادا کو نہیں ڈرایا گیا اور وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں)۔

اس سے قبل یہ بتایا گیا کہ اللہ نے رسول کو بھیجا اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس کی بعثت کی غرض و غایت کیا ہے اسے اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ ان لوگوں کو ڈرائے جن کے آباء و اجداد کو اب تک نہیں ڈرایا گیا تھا۔

قوم سے مُراد قوم عرب ہے۔ ان میں نبی آئے لیکن تنزیلِ کتاب یا قیامِ ملّت سے عاری تھے۔ ان رسولوں نے کسی ملّت کی تاسیس نہیں فرمائی تھی اور تاسیسِ ملت قیامِ رسالت کا لازمہ ہے۔ حضورؐ کی بعثت سے قبل یہود و نصاریٰ اہلِ کتاب بھی تھے اور ان کی الگ الگ ملّت بھی تھی مگر اہلِ عرب نہ کوئی ملّت تھے اور نہ اہلِ کتاب تھے اور چونکہ اس

ملّت کی بُنیاد مُلک یا نسل پر نہیں بلکہ توحید پر تھی اس لئے یہ ملّت عالمگیر اور سب غافلوں کے لئے ہدایت بن گئی۔

حضورؐ کی دعوتِ رسالت کا آغاز قریبی رشتہ داروں سے ہوا۔ پھر یہ دعوت مکّہ اور اس کے مضافات تک پھیلی، پھر اس کا دائرہ تمام عرب تک وسیع ہوا اور پھر جمیع النّاس کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ گویا دعوتِ حق کا دائرہ عشیرۂ اقربین سے تمام انسانیت تک پھیل گیا۔ "یٰاَیُّھَا النَّاسُ میں سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں" میں یہ نکتہ بھی ہے کہ خطاب کسی خاص قوم یا زمانے سے نہیں ہے بلکہ اس کا خطاب اس فطرتِ انسانی سے ہے جو انسانیت کی شناخت ہے۔ حضورؐ کو اگرچہ عرب میں مبعوث کیا گیا مگر آپ صرف عرب کے رسولؐ نہیں ہیں عجم کے بھی رسول ہیں، آپ کی رسالت ہر مکان اور ہر زمان پر محیط ہے۔

زیرِ مطالعہ آیت کا آخری لفظ غافلون ہے، حضور کی بعثت سے قبل عرب کے لوگوں کو یا غافلون کہا گیا ہے یا مُشرکوں، کافرون نہیں کہا گیا۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ دعوتِ رسالت سے قبل نہ کوئی کافر ہوتا ہے اور نہ مُنافق جب لوگوں کے سامنے ہدایت پیش کی جاتی ہے اور وہ ہدایت کا انکار کرتے ہیں اور راہِ حق میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں تو پھر وہ کافر بنتے ہیں۔ حضورؐ کی دعوت کے نتیجہ میں انسان تین گروہوں میں بٹ گئے یعنی مومن، کافر اور مُنافق۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓی اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۷

(بیشک ان کی اکثریت پر قول ثابت ہوچکا ہے (حجت تمام ہوچکی ہے) پس وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں)۔ وہ کون لوگ ہیں جن پر اللہ کا قولِ عذاب ثابت ہوچکا ہے جس کے نتیجہ میں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ وہ لوگ جو شیطان کا اتباع کرتے ہیں۔ جو خدا کے بندے ہونے کی بجائے شیطان کے بندے بن جاتے ہیں۔

وہ لوگ جو اپنی "انا" کے تکبر میں گرفتار ہوتے ہیں، جو شہوت اور حرص وحسد کا راستہ اختیار کرتے ہیں شیطان کا اتباع اسی امر میں کرتے ہیں جو وہ وسوسہ اور تسویل (شیطان کا گناہوں کو آرائش دینا) کے ذریعہ کرتا ہے۔

متبعین شیطان 'غاوین' ہیں۔

غاوین سے مراد وہ گمراہ ہیں گمراہی جن کی طبیعت کا حصّہ بن گئی ہے جنھوں نے اپنی فطرت کو اس کی اصل نہج سے ہٹا کر اس طرح مسخ کر لیا ہے کہ بُرائی ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ اب یہ بُرائی کو بُرا نہیں سمجھتے۔ گناہوں سے توبہ کر کے نیکی کی طرف رجوع نہیں کرتے بلکہ برائی پر مداومت کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔ انسان جب تک کوئی عمل نہیں کرتا وہ آزاد ہے۔ مگر جب وہ کوئی قدم اُٹھا لیتا ہے تو مرہونِ عمل ہو جاتا ہے اب وہ نہ بُرائی کو مٹا سکتا ہے اور نہ اس سے فرار کر سکتا ہے۔ اس منزل پر انسان کے سامنے دو راستے کھلے ہوئے ہیں، یا تو وہ اپنی غلطی پر نادم ہو اور توبہ کر کے نیکی کی طرف رجوع کرے اور اگر وہ توبہ نہیں کرتا اور گناہوں پر اصرار کرتا جاتا ہے تو بُرائی اس کی طبیعت کا حصّہ بن جاتی ہے۔ انسان کی اصل فطرت جیسا کہ حضرت آدمؑ کے قصّہ میں علامتی طور پر بیان کیا گیا ہے اس طرح بتائی گئی ہے کہ انسان غلطی کا ارتکاب کرتا ہے مگر جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو اس پر ندامت کا اظہار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے اور اسے راہِ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ امام زین العابدینؑ نے صحیفۂ سجادیہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہوئے خاص طور پر دو باتوں کا ذکر کیا ہے، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی حمد کا طریقہ سکھایا اور دوسرے یہ کہ اس نے انسان کو توبہ کا طریقہ تعلیم دیا یہ وہ طریقہ ہے جو انسانوں کو ہلاکت سے بچاتا اور اللہ کے غضب سے محفوظ رکھتا ہے۔ انسان اپنی فطری کمزوری کی وجہ سے غلطی کا مرتکب ہے لیکن اس پر توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ اگر وہ خود پر توبہ کے دروازے بند کرتا ہے تو پھر وہ اپنی فطرت کو مسخ کر کے غاوین میں

شامل ہوجاتا ہے اور غاوین وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا قولِ عذاب ثابت اور واجب ہو چکا ہے۔

اسی طرح وہ لوگ جنہوں نے شیطان کو خود پر مُسلّط کرلیا ہے اللہ کی پناہ کے حصار سے محروم ہو گئے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں ان پر شیطان کو کوئی سُلطان یعنی طاقت اور تسلّط حاصل نہیں ہو سکے گا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں پر شیطان کو تسلّط حاصل ہے وہ اللہ کی بندگی کے حصار سے خارج اور اس کی پناہ سے محروم ہیں اور جو اللہ کی پناہ سے محروم ہو اس کو تباہی یا ہلاکت سے کون بچا سکتا ہے۔

ایک اور گروہ ان لوگوں کا ہے جو جھوٹے خداؤں اور ظالموں کی پذیرائی کرتے ہیں۔ یہ ظالموں اور جابروں کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ گمراہی اور ظلم کو قبول کر کے ظالم کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں اور ظلم و فساد کے نظام کو تقویت پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔ یہ عذر کہ یہ ارباب من دون اللہ دولت اور طاقت رکھتے تھے اور ہم بے بس تھے اور اس طرح اپنی گمراہی کا ذمّہ دار ائمہ ضلالت کو ٹھہرانا اور گمراہی اور ظلم کی مخالفت نہ کرنے کا جواز پیش کرنا ایک کمزور عُذر ہے۔ اگر لوگ ظلم کی مخالفت نہیں کرتے تو کم از کم اس سے عدمِ تعاون تو کر سکتے ہیں۔ کم از کم ظلم کو بُرا تو سمجھ سکتے ہیں۔ جو لوگ ظلم سے تعاون نہیں کرتے وہ ظالم کے ظلم میں شریک ہیں ۔ وہ اپنی ذمّہ داری سے نہیں بچ سکتے۔ ظلم کے راستے میں ایک حد وہ بھی آتی ہے جب کوئی شخص ظلم کی ذمّہ داری کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ یزید ابن زیاد کو بُرا کہتا ہے اور ابن زیاد یزید کو مجرم ٹھہراتا ہے مگر کوئی شخص کسی طرح اپنی ذمّہ داری سے نہیں بچ سکتا۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جو اپنے نفس کی کمزوریوں کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے اور جن کا ٹھکانہ جہنّم ہے۔

ایک اور موقع جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے وہ ہے جب لوگوں کو جہنّم کی طرف لے جایا جا رہا ہے اور فرشتے ان سے سوال کر رہے ہیں کہ کیا تمہاری طرف کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا

اس کے جواب میں وہ اقرار کریں گے کہ ہدایت تو آئی تھی مگر ان کے تکبر نے ان کو عقل سے کام نہیں لینے دیا اور کلمۂ عذاب ان پر محقق ہو گیا۔

اسی طرح وہ لوگ جن کا سینہ بدی کے لئے کشادہ ہو گیا۔ جو اپنی حقیقت سے غافل ہیں۔ جو معاد کو بھولے ہوئے ہیں۔ جو دنیا میں اس قدر ملوث ہیں کہ کبھی اپنے مقصدِ تخلیق، اپنی ذمہ داری، اپنی حقیقت اور اپنی انسانیت کے متعلق غور و فکر نہیں کرتے یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ان کے قلوب اور ان کی سماعت پر مہریں لگا دی گئی ہیں، ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔ ان پر عذابِ الٰہی محقق ہو چکا ہے۔

گویا وہ لوگ جو وحی کی ہدایت کو نہیں مانتے بلکہ شیطان کے وسوسے کا شکار ہیں جنہوں نے بصیرت سے کام لے کر برائی اور بھلائی میں تمیز نہیں کی بلکہ جو تسویل میں گرفتار ہو کر برائی اور بھلائی کا فرق نہیں سمجھتے جن کی نظروں میں گناہوں کو زینت دے دی گئی ہے۔ جو عادی ہیں گمراہی جن کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے، جو شیطان سے اس قدر مغلوب ہو گئے کہ انہوں نے خود کو اللہ کی پناہ سے محروم کر لیا، جو ظالم کے ظلم کی مخالفت نہیں کرتے، جو انبیاء کی دعوت پہ تعمق نہیں کرتے۔ جو ہدایت آنے کے باوجود غفلت کا شکار ہیں، جو ہدایت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ جو مسرف یعنی حد سے گزرنے والے ہیں۔ جو فاسق ہیں جو اللہ کے عہد کو میثاق کے بعد توڑنے والے ہیں۔ جو ان رشتوں کو توڑنے والے ہیں جن کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے یہ سب وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے عمل سے خود پر اللہ کے قول عذاب کو محقق کر لیا ہے۔

انسان خود اپنے عمل سے اپنی گمراہی کا جواز پیش کرتا ہے اور وہ انسان جو اپنے جہل و غفلت، طغیان و تکبر، حبِ دنیا علی الآخرۃ میں گرفتار ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول محقق ہو جاتا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اور عذاب جہنم کے سزاوار ہیں۔

"لا یہدی القوم الکافرین" وہ اس لئے کافر نہیں ہیں کہ ان کی ہدایت نہیں ہوئی بلکہ چونکہ قوم کافرین ہیں اس لئے ہدایت نہیں ہوئی اور اپنی اسی بے بصیرتی

پر انہیں اصرار ہے۔ انسان کی فطرت اسی طرح بنائی گئی ہے کہ اس میں اگر لغزش کا امکان ہے تو لغزش کے بعد توبہ کرنے اور نیکی کی طرف رجوع کرنے کا رجحان بھی ہے خطا کے بعد توبہ اور پھر نیکی کی طرف رجوع طریقۂ آدمؑ ہے اس کے برعکس شیطان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ گناہوں پر اصرار کرتا ہے اور جو لوگ گناہوں پر اصرار کرتے ہیں ان پر ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُقْمَحُونَ ﴿٨﴾ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ﴿٩﴾

(ان کی گردنوں میں بھاری طوق ڈال دیئے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں پس وہ گردنیں اوپر اکڑائے ہوئے ہیں ہم نے ایک دیوار ان کے آگے اٹھادی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے۔ پھر اوپر سے انھیں ڈھانپ دیا ہے اور وہ کچھ دیکھ ہی نہیں سکتے)۔

ان دو آیتوں میں دو ایسی تصویریں (IMAGES) پیش کی گئی ہیں جو نہایت عبرتناک اور لرزہ انگیز ہیں۔ یہ ایک ایسے انسان کی تصویر ہے جو زنجیروں میں جکڑا ہوا بے حس و حرکت کھڑا ہوا ہے۔ زنجیریں اس کے سینے کے گرد اس طرح تنگ ہیں کہ اسے سانس لینا بھی مشکل ہے ان زنجیروں کا حلقہ سینے سے ٹھوڑی تک ہے، اس کی ٹھوڑی اوپر کی طرف اس طرح اٹھی ہوئی ہے کہ وہ زمین کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا اور دوسری تصویر میں یہ منظر پیش کیا گیا ہے کہ اس کے آگے بھی دیوار ہے، اس کے پیچھے بھی دیوار ہے۔ وہ نہ آگے دیکھ سکتا ہے نہ پیچھے۔ نہ نیچے دیکھ سکتا ہے اور نہ اوپر۔ اور یہ ایسے انسانوں کی تصویریں ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال رکھے ہیں اور ہم نے ان کے آگے اور پیچھے دیوار کھڑی کر دی ہے۔

درحقیقت کلام پاک کا اسلوب بیان یہ ہے کہ انسانوں کے اعمال کا جو لازمی

نتیجہ ہوتا ہے اسے اللہ اپنی طرف نسبت دیتا ہے اس لئے کہ یہ نتیجہ ان قوانین کے تحت ہی نکلتا ہے جو قوانین اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں کے دل میں مرض ہوتا ہے اللہ اسے بڑھا دیتا ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے اس مرض کی جو دوا تجویز کی تھی انہوں نے اس سے گریز کیا اس طرح ان کا مرض بڑھتا چلا گیا۔ یا جب یہ کہا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بستی کی تباہی کا ارادہ کرتا ہے تو اس بستی کے صاحبانِ اقتدار و ثروت کو فسق کا حکم دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں ایک وہ موڑ بھی آجاتا ہے جب ان کی تباہی ناگزیر ہو جاتی ہے یہ حالات اس ظلم کا نتیجہ ہوتے ہیں جو اس بستی کے بڑے لوگوں کا شعار ہیں مگر اللہ اس نتیجہ کو اپنی طرف نسبت دیتا ہے مدعا یہ کہ تباہی فرد کی ہو یا قوم کی ایک قاعدے اور قانون کی پابند ہے۔ اور یہ قاعدے اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں اللہ تعالیٰ کا امر نہیں ہے کہ فرد یا قوم تباہی کے راستے پر چلے لیکن جب کوئی فرد یا قوم اللہ تعالیٰ کے امر کا انکار کرتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ تباہی کی صورت میں نکلنا ہی اس کا امر ہے البتہ اس کی مشیت سے کوئی شے باہر نہیں ہو سکتی۔ نوشتۂ ازل علم الٰہی ہے۔ امرِ الٰہی یا رضائے الٰہی نہیں ہے۔

اگر ہم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ کلام پاک کے محاورہ میں اللہ تعالیٰ ہر اس بات کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے جو بندوں کے اعمال کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے اور وہ اس لئے کہ یہ نتیجہ ان قواعد اور قوانین کے تحت برآمد ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں تو پھر ہم اس بات کو بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ زیرِ مطالعہ آیتوں میں گمراہ لوگوں کے متعلق جو یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم نے ان کی گردن میں طوق ڈال رکھے ہیں۔ ہم نے ان کو زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اور ہم نے ان کے آگے اور پیچھے دیواریں کھڑی کر دی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ غلامی کا طوق، یہ زنجیریں، یہ دیواروں کا حصار دراصل خود گمراہ لوگوں

کی بداعمالیوں اوران کے اپنے کرتوت کا نتیجہ ہے۔ مگر یہ نتیجہ برآمد کرنے والا اللہ ہے۔ یہ حقیقتِ حال ہے۔ انسان عمل کرتا ہے مگراس کا نتیجہ اللہ کی طرف سے برآمد ہوتا ہے۔ ہر عمل اپنے مکافات کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور عمل اور مکافاتِ عمل کا یہ قانون اللہ نے بنایا ہے۔ یہ قانون عدل پر مبنی ہے جس کے تحت بُرائی کا لازمی نتیجہ بُرائی ہے اور بھلائی کا لازمی نتیجہ بھلائی ہے۔ بُرائی کے علاوہ کسی اور صورت میں ظاہر نہیں ہو سکتا۔ اسی تناظر میں ہمیں ان آیاتِ مبارکہ میں کھینچی گئی تصویروں (IMAGES) پر غور کرنا ہے۔

مگراس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان توجیہات کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے جو بعض مفسرین کی طرف سے ان آیات کی تاویل کے طور پر پیش کی گئی ہیں مثلاً یہ کہا گیا ہے کہ ایک موقع پر جب حضورؐ محوِ عبادت تھے ابوجہل یہ چاہا کہ آپؐ کو پتھر کے ذریعے ایذا پہنچائے اور جب اس نے آپؐ کی طرف پتھر پھینکنے کے لئے اپنا ہاتھ گردن تک اُٹھایا تو اللہ کی قدرت سے اس کا ہاتھ اسی حالت میں شل ہو گیا۔ ایک دوسرے شخص نے ابوجہل کے ہاتھ سے وہ پتھر لے لیا اور جب اس نے حضور کو ایذا پہنچانے کے لئے پتھر پھینکنے کا ارادہ کیا تو دیکھا کہ ایک شیر حضورؐ کی حفاظت کر رہا ہے اس لئے وہ مفسد شخص خوف زدہ ہو کر شرارت سے باز آیا۔ اسی طرح یہ واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ بنی مخزوم کا ایک شخص حضورؐ کو قتل کرنے کے ارادے سے آپؐ کی طرف بڑھا تو دیواروں کا حصار حائل ہو گیا جس کی وجہ سے وہ آپؐ کو قتل نہ کر سکا۔

ہم اس طرح کے واقعات کے بارے میں صرف اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ اس طرح کے واقعات انبیاء کے تاریخی حالات سے بہت زیادہ مُطابق نظر نہیں آتے حضرت موسیٰؑ کے متعلق قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ شہر سے ایسی حالت میں نکلے کہ خائف و ترساں تھے، خود حضورؐ نے جب ہجرت فرمائی تو اپنی حفاظت کے تمام اقدامات کئے جنگ اُحد میں حضورؐ کے دندانِ مُبارک کا شہید ہونا تاریخی طور پر ثابت ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ

ہر بات پر قادر ہے لیکن اس بدبخت کا ہاتھ شل نہیں ہوا جس نے رسولؐ کی نواسی کے سر سے چادر چھینی۔ ہمیں مفسرین کی تاویل یا ان واقعات کی صداقت سے انکار نہیں ہے مگر ہمارا نکتۂ نظر یہ ہے کہ نسبتاً کم اہم باتوں کو غیر ضروری حد تک اہمیت دینے سے فکر و نظر کا توازن بگڑ جاتا ہے اور آیاتِ الٰہی کی معنویت محدود ہو جاتی ہے۔

اَب ہم پھر ان تصویروں (IMAGES) کی طرف لوٹتے ہیں۔ ان تصویروں پر غور کرنے کے لئے ہمیں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ اگرچہ حضورؐ تمام انسانیت کے ہادی ہیں، اور اگرچہ کلام پاک تمام انسانیت سے خطاب کرتا ہے مگر حضورؐ کی بعثت ملکِ عرب میں ہوئی! اسی لئے قرآن کو عربی مبین میں نازل کیا گیا۔ اور قرآن میں جو محاورے، تمثیلیں، تشبیہات، استعارات اور مناظر استعمال کئے گئے وہ عرب کے مخصوص مذہبی، سماجی، اقتصادی اور معاشرتی پس منظر سے اخذ کئے گئے ہیں حضورؐ کی بعثت سے قبل اہلِ عرب اوہامِ باطلہ اور حمیت جاہلیہ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ دہر کی قوتوں سے خائف تھے جس کا دل خشیت الٰہی سے خالی ہوتا ہے وہ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگتا ہے۔ یہی حال عربوں کا تھا۔ ان کی زندگی خوف اور حزن کی قید میں محصور تھی۔ اپنے خوف اور حزن کا مداوا وہ استغنا اور عیش کوشی کے ذریعے کرنا چاہتے تھے۔ گویا ان کی زندگی کا باطن خوف اور حزن تھا اور ظاہر استغنا، اور تعیش، وہ عیش کوشی کے ذریعے یہ چاہتے تھے کہ خوف اور حزن کی قید سے نجات حاصل کرلیں مگر اس طرح وہ خوف کی زنجیروں کے ساتھ ساتھ خواہشات اور شہوات کی زنجیروں میں بھی جکڑتے چلے جاتے تھے، ان کی سرکشی انہیں حقیقت کو دیکھنے سے باز رکھتی تھی اور اس طرح ان کی حالت اس انسان کی سی ہو جاتی تھی جس کی گردن میں طوق ہو، جس کے سینے سے ٹھوڑی تک زنجیروں کا حلقہ ہو، ان زنجیروں کے بوجھ سے اس کا سینہ دَب رہا ہو۔ یہاں تک کہ اسے سانس لینا بھی مشکل ہو اور انہی زنجیروں کی وجہ سے اس کی ٹھوڑی اس

طرح اوپر کو اُٹھی ہوئی ہو کہ اس کی آنکھیں اُبل رہی ہوں۔ اور وہ اس قید کی حالت میں بے حس و حرکت کھڑا ہو۔ اور یہ قید کی حالت اس لئے ہے کہ اس نے آزادی کے راستے پر چلنے سے انکار کر دیا ہے۔ انسان کے لئے آزادی کا راستہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ انسان اللہ کی ہدایت کا اتباع کرے۔ یہ اتباع اسے ہر طرح کی غلامی سے آزاد کراتا ہے۔ لیکن جب انسان ہدایت کی پیروی سے انکار کر کے شیطان کی پیروی اختیار کرتا ہے تو وہ خود کو طرح طرح کی زنجیروں میں گرفتار کرتا جاتا ہے۔ جو شخص ہدایت کا انکار کرتا ہے اسکی گردن میں طغیان اور سرکشی کا طوق ہے۔ اس کی گردن اکڑی ہوئی ہے۔ اسکی ٹھوڑی اوپر کو اُٹھی ہوئی ہے اور اس کی آنکھیں اُبل رہی ہیں اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ان سے وہ کوئی کارِ خیر نہیں کر سکتا۔ دوسروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے دل میں ہوس و ہوس کا طوفان اُمنڈ رہا ہے جس کے نتیجہ میں خواہشات اور شہوات کی زنجیریں اس کے سینے سے ٹھوڑی تک حلقہ کئے ہوئے ہیں اور یہ حلقہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ضیقِ نفس کی کیفیت ہے جو انشراحِ صدر کی کیفیت کی ضد ہے۔ ایمان کا نتیجہ انشراحِ صدر ہے اور ہدایت سے انکار کا نتیجہ قلب کی تنگی کی وہ حالت ہے جسے قرآن نے ضیقِ نفس سے تعبیر کیا ہے۔

گویا یہ ایک ایسے انسان کی تصویر ہے جس کی گردن میں سرکشی اور طغیان کا طوق ہے جس کے ہاتھ اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ وہ کوئی کارِ خیر انجام دے سکتا، جو اپنے خوف کا شکار ہے، جو ہوی و ہوس کی زنجیروں میں گرفتار ہے اور جس کی ٹھوڑی اوپر کو اُٹھی ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ خود سے پست تر لوگوں کی طرف دیکھنے سے معذور ہے اس کی ہوس مال و جاہ جو ہر لحظہ بڑھتی ہی جاتی ہے اسے اوپر دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ تصویر صرف دورِ جاہلیت کے عربوں ہی کی تصویر نہیں ہے بلکہ اس آئینہ میں ہر وہ شخص اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے جو ان خصوصیات کا شکار اور محبتِ مال و

جاہ میں گرفتار ہے۔

امام رازی نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ ٹھوڑی کا اوپر ہونا اس بات کی بھی علامت ہے کہ ایسا انسان خود اپنی حقیقت سے غافل ہے۔ اس کی نگاہیں اوپر کو ہیں اس لیے وہ اپنے نفس کو نہیں دیکھ سکتا اور انسان کے نفس میں اللہ کی جو آیات ہیں ان کے مشاہدے سے معذور ہے۔

دوسری تصویر (IMAGE) ایک ایسے شخص کی تصویر ہے جس کے آگے بھی دیوار ہے اور پیچھے بھی دیوار ہے۔ جس کے چاروں طرف ایسا حصار ہے کہ اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ یہ ایک ایسے انسان کی تصویر ہے جو اپنی حد سے بڑھی ہوئی انانیت میں گرفتار ہے۔ یہ وہ خود پسند شخص ہے جس کی زندگی کا مرکز اور دائرہ خود اس کی اپنی ذات ہے۔ اس کی انا نے اس کے آگے اور پیچھے دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ دوسرے انسانوں اور عالم فطرت سے اس کا تعلق منقطع ہو گیا ہے۔ پہلی تصویر اس شخص کی تھی جو اپنے نفس میں آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرنے سے معذور ہے۔ یہ تصویر اس شخص کی ہے جو عالمِ آفاق میں قدرت کی نشانیوں کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی انا کے خول میں محصور ہے۔ وہ نہ آگے دیکھ سکتا ہے اور نہ پیچھے۔ نہ ماضی کی تاریخ سے عبرت حاصل کرتا ہے۔ نہ مشاہدۂ فطرت سے نصیحت حاصل کرتا ہے اور نہ معاد کے خوف سے اس کے اندر تقویٰ پیدا ہوتا ہے پہلی تصویر میں انسان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس تصویر میں اس کے پیر بھی جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ چل نہیں سکتا۔ حرکت اور سفر سے معذور ہے۔ ایمان کی زندگی مسلسل ہجرت ہے۔ خودی سے خدا کی طرف پیہم سفر ہے قرآن میں اس کے لئے صراط کا استعارہ استعمال ہوا ہے لیکن یہ اس شخص کی تصویر ہے جسے گویا زمین نے پکڑ رکھا ہے۔ وہ سفر نہیں کر سکتا۔ وہ اس کائنات کے مظاہر میں حق اور حسن کے جلووں کو دیکھنے سے معذور ہے۔ اس نے نہ صرف اس کائنات سے ہر طرح کا تعلق توڑ لیا ہے بلکہ آسمان سے بھی تمام

روابط منقطع کر لئے ہیں۔ وہ حرارت اور روشنی جس پر زمین کی زندگی اور زرخیزی کا انحصار ہے وہ آسمان سے رحمت کی صورت میں نازل ہوتی ہے۔ اس شخص نے آسمانی رحمت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا ہے اس لئے وہ ایک ایسا وجود ہے جو بنجر اور بانجھ ہے۔

پہلی تمثیل اس حالت کی ہے جس میں انسان ان آیات کے مشاہدے سے محروم ہے جو انفس میں ہیں اور یہ تمثیل اس حالت کی ہے جہاں وہ ان آیات کے مشاہدے سے بھی محروم ہے جو آفاق میں بکھری ہوئی ہیں۔

ایسے ہی گمراہوں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ان کے لئے برابر ہے کہ ان کو ڈرایا جائے یا نہ ڈرایا جائے۔ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠﴾

(اور ان کے لئے برابر ہے کہ تو انھیں ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں)۔

انذار کے معنی ہیں ڈرانا۔ امام راغب اصفہانی نے اپنی مفردات میں اس لفظ کے معنی یہ بتائے ہیں کہ انذار سے مُراد ہے کسی شخص کو راستہ کے خطرات سے متنبہ کرنا۔ اور تبشیر کا مطلب ہے راستے کے خطرات سے گزر کر منزل پر پہنچ جانے کی بشارت۔ دُنیا میں انسان کی زندگی ایک سفر ہے' اس سفر کے خطرات کی نشاندہی کرنا یہ نذیر کا کام ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ ہر قوم کی طرف ایک نذیر بھیجا گیا ہے۔

اس مرحلہ پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب لوگ ہدایت قبول کرنے والے نہیں ہیں تو پھر کارِ ہدایت یعنی انذار کا کیا فائدہ ہے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ رسولؑ کا کام پیغام پہنچانا ہے۔ اگر تمام انسانوں میں سے کوئی ایک شخص بھی اس پیغام کو قبول کر لیتا ہے تو کارِ رسالت بار آور ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سُنّت یہ ہے کہ وہ بندوں پر اپنے رسولوں کے ذریعے اپنی حجّت تمام کرتا ہے تاکہ جو ہلاک ہو وہ بین حجّت

کے ذریعہ ہلاک ہو اور جو زندہ ہو وہ روشن ہدایت کے ذریعے زندہ ہو۔ رسولؐ کا کلام بلاغ مبین ہے۔ رسولؐ کا رسالت ایک سلطان کے ذریعے انجام دیتا ہے اگر رسولؐ کی دعوت پر کوئی ایک انسان بھی لبیک نہ کہے تو یہ تمام انسانیت کی ہلاکت پر حجت ہے لیکن رسولؐ کی آواز پر اگر ایک انسان بھی لبیک کہتا ہے تو وہ تمام انسانیت کی نمائندگی کر کے لوگوں کو اللہ کے عذاب سے بچالیتا ہے۔ امام حسینؑ کی دعوتِ حق پر ایک حُر نے لبیک کہہ کر انسان کی آبرو رکھ لی۔

إِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ ۖ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ ﴿١١﴾

(تم تو صرف اسی کو ڈرا سکتے ہو (متنبہ کر سکتے ہو) جو نصیحت قبول کرے اور بن دیکھے رحمٰن کا خوف رکھے۔ پس اس کی مغفرت اور عمدہ اجر کی بشارت دے دو)۔

نصیحت کو قبول کرنے سے پہلے قبول کرنے کی صلاحیت، اس کی استعداد بہم پہنچانی ضروری ہے۔ انذار سے فیض اُٹھانے کی پہلی شرط ذکر کا اتباع ہے۔ گمراہ لوگ جن کی تصویریں (IMAGES) اس سے قبل پیش کی گئی ہیں وہ شیطان کا اتباع کرتے ہیں۔ وہ اپنی ہوئی و ہوس اور شہوات اور لذات کا اتباع کرتے ہیں مگر جو شخص ہدایت کو قبول کرنے والا ہے وہ ذکر کی پیروی کرتا ہے۔ ذکر بھولی ہوئی حقیقت کا استحضار اور اس حقیقت سے نصیحت حاصل کرنا ہے، ذکر کا اتباع کرنے کا مطلب کھلی سمع اور بصر اور زندہ طلب کے ساتھ زندگی کے صحیح راستہ کو تلاش کرنا ہے اور اس پر چلنا ہے۔ اور جن کے دل میں حق کی طلب و تلاش کی تڑپ اور لگن ہے وہ زندگی کے راستہ کے خطرات سے بچ کر سلامتی کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ خشی وہ خوف اور حیرت کی کیفیت ہے جو کسی شے کی لامحدود عظمت کے احساس سے پیدا ہوتی ہے، یہ نامعلوم چیز کا خوف نہیں ہے۔ یہ تکبر کی ضد ہے۔ یہ استکبار کی ضد انکسار ہے جو ہر

مذہبی تجربہ کی بُنیاد ہے۔ اور یہ انکسار یہ خشیّ عالمِ ظاہر میں لاتعداد رحمت کی نشانیوں کے پیچھے عالمِ غیب میں رحمٰن کی معرفت اور اس کی عظمت کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ انذار راستہ کے خطرات کی نشاندہی ہے۔ ظاہر ہے اس ہدایت سے وہی فائدہ اُٹھاتا ہے جو راستہ پر چل رہا ہے، وہی صحیح سمت میں راستہ کے خطرات سے گزر کر منزل تک پہنچتا ہے جس کا منتہیٰ رَبّ ہے۔ یہی مغفرت اور اجرِ کریم کی بشارت ہے۔ مغفرت کا مطلب ہے کسی شے کو اس طرح ڈھانک لینا کہ وہ ہر طرح کے گرد وغبار سے محفوظ رہے اور اجرِ کریم سے مُراد ہے انسان کی تمام صلاحیتوں کی تکمیل، سعادت اور قُرب کا حصُول اپنی انسانی حد و انتہا تک۔

نبی کی دعوت غفلت سے بیداری، ظلمت سے نور اور موت سے زندگی کی طرف ہجرت کا پیغام ہے اس دعوت کو وہی قبول کرتا ہے جس کا قلب زندہ ہے اور قلب کی زندگی کی نشانی یہ ہے کہ اس کے اندر حق کی تلاش اور جستجو ہو۔ ایسے لوگوں کی دو خصوصیات بتائی گئی ہیں ایک اتباعِ ذکر اور دوسری خشی الرحمٰن بالغیب۔ قرآن میں ہدایت متقیوں کے لئے ہے۔ اس میں انذار ان لوگوں کے لئے ہے جو زندہ ہیں۔

خشیت رحمٰن کے ساتھ بالغیب کی دو طرح کی تفسیر کی گئی ہے۔ اس کی پہلی صُورت تو یہ ہے کہ دُنیاوی زندگی میں اللہ وہ حقیقت ہے جو غیب میں پنہاں ہے۔ موت کی بعد کی زندگی میں حقیقت بے حجاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ گویا خشی الرحمٰن بالغیب سے مُراد دُنیاوی زندگی میں اللہ کا خوف ہے۔ یہ ایمان بالغیب کی منزل ہے جو تقویٰ کی پہلی شرط ہے۔ اور خشی الرحمٰن بالغیب کی دوسری صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ کا ایسا خوف جو صرف دکھاوے کی حد تک محدود نہیں ہے۔ جو شخص صرف دوسروں کو دکھانے کے لئے اللہ سے ڈرتا ہے وہ خشی الرحمٰن کا مصداق نہیں ہے بلکہ اللہ سے ڈرنے کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی خلوتوں میں اللہ سے ڈرتا ہے۔ وہ

راتوں کی تنہائی میں اس سے ہدایت اور استعانت طلب کرتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس کا دل خشیتِ الٰہی سے لبریز ہے۔ اس کا تقویٰ منافق کی طرح صرف تصنع یا دکھاوا نہیں ہے۔ بلکہ وہ صحیح معنوں میں اللہ سے ڈرنے والا بندہ ہے اس لئے کہ اس کا دل خشیت الٰہی سے لبریز ہے۔

زیرِ مطالعہ آیت میں خشیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جمالی شان یعنی رحمت کا ذکر آیا ہے۔ خوف اور رحمت کا ساتھ ساتھ ذکر کر کے اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ مومن کے دل میں اللہ کا خوف کسی ظالم، جابر یا قاہر کا خوف نہیں ہے بلکہ یہ اس اللہ کا خوف ہے جو رحمٰن ہے جو اپنے بندوں پر ان کے ماں اور باپ سے زیادہ شفیق اور مہربان ہے۔ انسان اس خدائے رحمان کی عطا کردہ نعمتوں کا شمار نہیں کر سکتا۔ اس کے رحمٰن ہونے کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے نافرمان بندوں کو بھی اپنی نعمتوں سے محروم نہیں کرتا البتہ نافرمان بندے اس کی رضا سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مومن ہر حال میں رضائے الٰہی کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ وہ اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ اپنے رب کو ناراض کرنا بندے کی سب سے بڑی بدقسمتی اور محرومی ہے۔ اس لئے وہ ہر لمحہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ کہیں اس کا کوئی عمل اس کے رب کی ناخوشی کا موجب نہ بن جائے۔ خشی الرحمٰن کی یہی وہ کیفیت ہے جسے تقویٰ کہا جاتا ہے کہ کہیں اس کا کوئی عمل اس کے رب کی ناخوشی کا موجب نہ بن جائے۔ خشی الرحمٰن کی یہی وہ کیفیت ہے جسے تقویٰ کہا جاتا ہے۔ تقویٰ کے ایک معنی ہیں کسی خاردار راستہ پہ دامن کو اس طرح سمیٹ کر چلنا کہ دامن کانٹوں میں نہ اُلجھ جائے۔ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ قدم قدم پر اللہ سے ڈرتا بھی جا رہا ہے اور اس کی طرف بڑھتا بھی جا رہا ہے اور جس حد تک وہ اللہ کی طرف بڑھ رہا ہے، جس قدر اس کا قرب حاصل کر رہا ہے، جس قدر اس کی معرفت بڑھتی جا رہی ہے اس کی خشیت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جس کی طرف بڑھنا اسی سے ڈرنا، جس واحد

ہستی سے ڈرنا اسی کی طرف بڑھنا، بڑھنا اور ڈرنا اور ڈرنا اور بڑھنا ہی تقویٰ ہے۔ دین کے راستہ میں قدم قدم پر خطرات ہیں۔ اس راستہ میں کوئی مقام ایسا نہیں ہے جو خطرات سے خالی ہو۔ جتنا انسان اس صراطِ مستقیم پر آگے بڑھتا جاتا ہے اس کے درجات اور مقامات بلند ہوتے جاتے ہیں اور اسی نسبت سے اس کے خطرات بڑھتے جاتے ہیں۔ انذار کا مقصد اس راستہ کے خطرات سے متنبہ کرنا ہے اور ظاہر ہے خطراتِ راہ سے اسی کو متنبہ کیا جائے گا جو اس راستہ پر سفر کر رہا ہو جو شخص اس راستہ پر سفر ہی نہ کر رہا ہو اس کو اس خطرات سے ڈرانا یہ نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ نبی کی ہدایت یعنی انذار انہی لوگوں کے لئے مفید ہے جو اتباع ذکر کرتے ہیں اور جو خدائے رحمٰن سے ڈرتے ہیں۔ یہ ایمان لانے والوں کی خصوصیات ہیں اور ایمان نہ لانے والے وہ ہیں جن کی گردن میں طوق ہیں، جن کے سینہ سے ٹھوڑی تک زنجیروں کا حصار ہے۔ جن کے آگے اور پیچھے دیواریں ہیں جن کے ہاتھ بھی بندھے ہوئے ہیں۔ پیر بھی جکڑے ہوئے ہیں اور جو بصارت سے بھی محروم ہیں۔ وہ اپنی انا کے خول میں محصور، اپنی خواہشات اور شہوت کے غلام اور شیطان کے پیروکار ہیں۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۲﴾

(بے شک ہم بالتحقیق مردوں کو زندہ کریں گے اور ہم لکھتے جاتے ہیں جو کچھ وہ آگے بھیجتے ہیں اور جو کچھ ان کے پیچھے رہ جاتا ہے اور ہم نے ہر شے کا امام مبین میں احاطہ کر رکھا ہے)۔

اس آیت میں تین باتوں کا ذکر ہے (۱) اللہ مُردے کو زندہ کرتا ہے (۲) کتابِ اعمال جو نفسِ انسانی پر نقش ہے (۳) امام مبین یا کتاب مبین یا لوحِ محفوظ یا علمِ الٰہی جو ہر شے پر محیط ہے۔

موت میں سے زندگی کا برآمد کرنا اللہ تعالیٰ کی شانِ تخلیق ہے۔ اسی طرح

میں موت سے زندگی برآمد کرنے کی نشانی ہمارے لئے مُردہ زمین کی بیان کی گئی ہے جس کو اللہ زندہ کرتا ہے اور جس سے وہ اناج نکالتا ہے اور کھجوروں اور انگوروں کے باغات اُگاتا ہے اور چشمے جاری کرتا ہے جس پر اس کی مخلوق کی زندگی کا دارومدار ہے۔ انسان کی زندگی اور موت کی کئی سطحوں کا قرآن میں ذکر ہے۔

① انسان کا اس دُنیا میں پیدا ہونا

② انسان کا ایمان کے ذریعہ اس کے قلب کا زندہ ہونا، کفر اور ایمان میں فرق ظلمت اور نور، موت اور زندگی کا فرق ہے، ایمانی زندگی یا حیوۃ طیبہ ایک نئی زندگی ہے۔

③ ہدایت کو قبول کر کے کسی مردہ قوم کا زندہ ملت میں تبدیل ہونا

④ قیامت میں مردوں کو زندہ کیا جانا

اس کے علاوہ بھی موت اور زندگی کی مختلف کیفیتیں ہو سکتی ہیں جن کا علم اللہ کو یا راسخون فی العلم کو ہے۔

وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ

اس سے مُراد یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی جو عمل کر رہا ہے۔ وہ بلا کم و کاست تحریر کیا جا رہا ہے۔ انسان کا کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو صحیفۂ اعمال میں ثبت و ضبط نہ کیا جا رہا ہو، انسان کا نفس بھی اس کا صحیفۂ اعمال ہی ہے، ہر عمل مع اپنی نیت و عواقب کے، جو وہ کر رہا ہے اس کا قایم رہنے والا نقش اس کے نفس پر ثبت ہو رہا ہے جس کے لحاظ سے اس کی حقیقت انسانی روشن ہو رہی ہے یا مسخ ہو رہی ہے۔ یہ حقیقت اگر اس پر واضح ہو جائے تو اس سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔

مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ کے ایک معنی تو یہ کئے گئے ہیں کہ ① موت سے پہلے کے اعمال اور ② خیر و شر کے اثرات جو پیچھے چھوڑ گئے ہیں اور دوسرے معنی

"قَدَّمُوْا" کے عمل سے پہلے نیت اور "آثار" خود عمل۔ یہ معنی بعید الفہم ہیں۔
یہ کتاب اعمال ہر شخص کی وہ کتاب ہے جو اس کی گردن میں پڑی ہوتی ہے۔ یہ قلم قدرت
کی وہ تحریر ہے جو مٹ نہیں سکتی۔ جسے ہر شخص خود قیامت میں پڑھ سکے گا اور جسے
خاصانِ خدا اس دُنیا میں بھی پڑھ سکتے ہیں۔

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَٰهُ فِىٓ إِمَامٍ مُّبِينٍ

احصاء کے معنی ہیں کسی شے کا شمار کرکے اس کے گرد دائرہ کھینچنا۔

اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کا احصیٰ کتابت سے ثبت کرتا ہے۔ یہ کتابت صحیفہ
کائنات میں ہے۔ صحیفہ تاریخ میں ہے، صحیفۂ عمل میں ہے۔ اور یہ سب "کتاب
مبین" ہی ہیں۔

① صحیفۂ کائنات — "کتاب مبین"

"کوئی ذرّہ برابر شے یا اس سے چھوٹی یا بڑی اس سے پوشیدہ نہیں۔ خواہ
وہ آسمانوں میں ہو، خواہ وہ زمینوں میں ہو، مگر وہ کتابِ مبین میں موجود ہے۔"
(سورۂ سبا آیت ۳)

"اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ انہیں کوئی نہیں جانتا سوائے اس کے۔
اور وہ جانتا ہے جو کچھ بھی خشکی اور تری میں ہے۔ اور کوئی پتہ بھی نہیں گرتا مگر
وہ اسے جانتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں (ایسا) ہے اور نہ ہی
کوئی تر اور خشک ایسا ہے مگر وہ کتابِ مبین میں ہے۔" (سورۂ انعام آیت ۵۹)

② صحیفۂ تاریخ

"اور تو ہر اُمت کو گھٹنوں کے بل دیکھے گا، ہر اُمت کو اس کی کتاب کی طرف
بُلایا جائے گا۔ آج کے دن جو کچھ تم کرتے تھے۔ اس کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ یہ ہے
ہماری کتاب جو تم پر سچ ہی بولے گی۔ ہم تو لکھتے رہتے تھے جو تم کیا کرتے تھے۔"

(الجاثیہ آیت ۲۸-۲۹)

۴ صحیفۂ اعمال

"اور ہر انسان کا "طائر" ہم نے اس کے گلے کا ہار بنا دیا ہے اور ہم اسے قیامت کے دن اس کتاب کی صورت میں نکالیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا، پڑھ لے اپنی کتاب تو آج کے دن اپنا حساب کرنے کے لئے خود ہی کافی ہے۔"

(سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۳-۱۴)

امام کا لفظ کلام پاک میں مختلف معنی میں آیا ہے۔ امام مبین روشن راستے یا شاہراہ کے معنی میں آیا ہے (۱۵ الحجر ۷۹) امام کا لفظ کتاب کے معنی میں بھی آیا ہے کتاب موسیٰ اماماً ورحمۃً (۱۱ ہود ۱۷) اور امام کے معنی وہ جس کی پیروی اور اقتدا کیا جائے۔ لوگ اپنے امام کے ساتھ بلائے جائیں گے (۱۷ الاسرا ۷۱)

عام طور سے 'امام مبین' 'کتاب مبین' کے معنی میں لیا گیا ہے۔ جس کا ذکر کلام پاک میں مختلف ناموں سے آیا ہے۔ لوح محفوظ، ام الکتاب، الکتاب المبین" یہ علم الٰہی کا اشارہ ہے' جو ہر غلطی سے محفوظ ہے' اور جس میں تمام چیزوں کا احصیٰ کیا گیا ہے۔ ھُوَ کُلِّ شَیْءٍ عَلِیْم۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ کتابت اعمال (مَاقَدَّمُوْا وَاٰثَارَھُمْ) ہی کتاب مبین میں احصیٰ ہے لیکن ظاہر آیات کا تقاضہ ہے کہ کتابت اعمال کتاب مبین یا امام مبین میں شامل ہے لیکن کتاب مبین یا امام مبین اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔ عِلْمَ اللّٰہِ الْاَزَلِی الْقَدِیْم جو ہر شے پر محیط ہے۔ اور خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ امام مبین اسی لئے کہا گیا ہے کہ اس میں کتب الاعمال کے علاوہ خلق کے متعلق قضائے الٰہی کی تفصیل بھی شامل ہے جس کا خلق اتباع اور اقتدا کرتی ہے۔

تفسیر قمی میں امام مبین کے متعلق لکھا ہے یعنی کتاب مبین اور وہ محکم ہے اور

ابنِ عباس کے حوالے سے یہ روایت بھی نقل کی گئی ہے کہ جناب امیرؑ نے فرمایا کہ امام مبین میں ہوں کہ باطل کے مقابلے میں حق کو ظاہر کرنے والا ہوں۔ ایک دوسری روایت امام محمد باقرؑ کے حوالے سے ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ جناب رسالتمآبؐ نے امام مبین کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ علیؑ امام ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کا علم احصیٰ کیا ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتاب مبین لوحِ محفوظ، اُمّ الکتاب درحقیقت علم الٰہی کا استعارا ہیں۔ اللہ ہر شے پر اپنے علم کے ذریعے محیط ہے۔ بس کا وہ علم وہ کلی علم ہے جس سے تمام جزئیات پیدا ہوتی ہیں اور اس کا علم ماضی، حال اور مستقبل کی تفریق و تقسیم سے بلند ہے۔ یہ وہ علم کلی ہے جس میں ہر شے کا احصیٰ ہے۔ یہ وہ علم ہے جو اپنی مقدار کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ نوعیت کے اعتبار سے بھی کلی ہیں۔ کتابِ مبین اس علم کا استعارا ہے جتنی کتابیں نازل کی گئیں وہ اسی علم کی جھلکیاں ہیں۔ نبیؐ کو بھی اللہ نے اسی کلی علم کی جھلک عطا کی ہے اور اسی علم کی جھلک نبی کے وصی کو عطا ہوتی ہے۔ حقیقتِ کلی اور علم کلی اللہ تعالیٰ کا علم ہے، کتابِ مبین ہو یا امام مبین دونوں میں اسی علم کی جھلکیاں ہیں۔ اور چونکہ یہ اس علم کا پرتو ہے جو ہر شے پر محیط ہے اس لئے یہ کہا گیا ہے کہ ہر شے کا احصیٰ کتاب مبین میں بھی ہے اور امام مبین بھی ہے۔

جناب طباطبائی نے ان روایات کے متعلق جن میں اس آیت کے جناب امیرؑ سے نسبت ہونے کا ذکر کیا گیا ہے کہا ہے کہ اگر یہ دونوں روایات صحیح ہیں تو ان کا تعلق تفسیر سے زیادہ قرآن کے بطن اور اشارات سے ہے۔ پھر وہ فرماتے ہیں کہ کونسی شے مانع ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کو جو مخلص ترین بندہ ہے اور جو نبیؐ کا وصی اور نبی کے بعد سید الموحدین ہے اپنے کلی علم کا پرتو عطا کرے۔

دوسرا رکوع

اس رکوع میں ایک قریہ کی تمثیل بیان کی گئی ہے۔ اس تمثیل کے ذریعے دعوت رسالت کی حقیقت، اس دعوت کی طرف لوگوں کے رَدِّ عمل، اور اس ردِ عمل کے نتیجہ میں ملت کی تعمیر یا تخریب کے قانون کو بیان کیا گیا ہے۔

بعض علماء نے اس تمثیل کے متعلق ایک روایت بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ قصہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کا ہے جنہیں آپؑ نے ایک قریہ کے لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا تھا۔ وہ شہر انطاکیہ بتایا جاتا ہے اور ان حواریوں میں سے پہلے دو کا نام یونس اور یوحنا اور بعد میں آنے والے تیسرے کا نام شمعون بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے حکم سے پہلے یونس اور یوحنا انطاکیہ کے لوگوں کی ہدایت کے لئے روانہ ہوئے۔ شہر میں داخل ہونے سے پہلے ان کی ملاقات ایک گڈریئے سے ہوئی جس کا بیمار بیٹا ان کی دُعا سے شفایاب ہوگیا اور وہ ان پر ایمان لے آیا۔ پھر یہ لوگ شہر میں داخل ہوئے اور وہاں کے بادشاہ کو دعوتِ ایمان دی مگر اس نے ناراض ہو کر انہیں قید کر دیا۔ جب یہ خبر حضرت عیسیٰؑ تک پہنچی تو انھوں نے جناب شمعون کو انطاکیہ کی طرف روانہ کیا۔ انہوں نے مصلحت سے کام لے کر بادشاہ کی قربت اور اعتماد حاصل کر لیا۔ پھر ایک مناسب موقع پر جناب شمعون نے اپنے دونوں ساتھیوں کو جو قیدی تھے بادشاہ کے سامنے اپنی کرامات کے اظہار کا موقع فراہم کیا۔ بعض روایات کے مطابق ان کی دُعا سے بادشاہ کا مُردہ لڑکا زندہ ہوگیا اور وہ ان پر ایمان لے آیا مگر اہلِ شہر ان کے دشمن ہو گئے۔ اس گڈریئے نے جو ایمان لا چکا تھا اور جس کا نام حبیب نجار بتایا جاتا ہے اہلِ شہر کو ان رسولوں پر ایمان لانے

کی ترغیب دی مگر لوگ مخالفت پر کمربستہ رہے یہاں تک کہ ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوا۔

بائبل میں اس قصّہ کو نسبتاً مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس قصّہ کی رُو سے انطاکیہ وہ پہلی بستی تھی جس کے غیر اسرائیلی باشندوں کو حضرت عیسیٰؑ کا پیغام پہنچایا گیا۔ اسی قسم کی اور روایات بھی ہیں۔ ہم ان روایات کی طرف اشارہ کرکے آیات کے نفسِ مضمون کو سمجھنے کی طرف متوجّہ ہوتے ہیں۔

زیرِ مطالعہ آیات میں ایک مثل بیان کی گئی ہے۔ مثل کا مطلب ہے کسی حقیقت کو تمثیل کے طور پر بیان کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگرچہ کہ تمثیل کا تعلق کسی خاص جگہ یا کسی مخصوص زمانے سے بیان کیا جاتا ہے مگر تمثیل کے ذریعے پیش کردہ حقیقت مقام اور وقت کی قید سے ماورا ہوتی ہے۔ سچائی میں عمومیت اور آفاقیت ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۚ ﴿۱۳﴾

(ان کے لئے بستی کے لوگوں کی ایک تمثیل پیش کرو کہ جب ان کے پاس مُرسلین آئے)۔

اس تمثیل کے مضامین پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلے جو حقیقت کہ اگرچہ اضرِبْ لَهُمْ کہہ کر رسولؐ کو یہ حکم دیا جارہا ہے کہ تم ان کے لئے اہلِ قریہ کی مثال بیان کرو مگر مثل خود اللہ تعالیٰ بیان کررہا ہے یا یوں کہو کہ محمد رسول اللہ اہلِ قریہ کی مثل قرآن کی زبان میں بیان کررہے ہیں۔

اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

(پھر جب ہم نے ان کی طرف دو کو بھیجا پس انھوں نے ان دو کو جھٹلایا تو ہم نے ایک تیسرے سے ان کو مدد دی تو انھوں نے کہا "ہم تمہاری طرف (اللہ کے) بھیجے ہوئے آئے ہیں")۔

اسی طرح اِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ کہہ کر اس حقیقت کو اُجاگر کیا گیا ہے کہ رسول، اللہ کی طرف سے بھیجے جاتے ہیں۔ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا امر اور اس کا اذن ہوتا ہے۔ یہ امر و اذنِ الٰہی ان کے "سلطان" کی سند ہے۔

اہلِ قریہ نے رسولوں کی تکذیب کی۔ عام طور پر رسالت کی دعوت کی طرف لوگوں کا ردِّ عمل یہی ہوتا ہے کہ وہ رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ دعوت عقائد اور معیشت کے موجود نظام کے خلاف ایک انقلاب کی صورت میں ہوتی ہے۔ اہلِ مکّہ کا بھی یہی ردِّ عمل تھا۔ یہ رسول صاحب شریعت نہیں ہیں، بلکہ اپنے دین کی تبلیغ غیر قوم میں کر رہے ہیں۔

اس کے بعد یہ ذکر آیا ہے کہ جب اہلِ قریہ نے ان کا انکار کیا تو ان کی نصرت کے لئے تیسرے رسول کو بھیجا۔ سُنّتِ الٰہی یہ ہے کہ ایک صاحبِ شریعت رسول کی شریعت کی تبلیغ کرنے کے لئے اور اس پر عمل کروانے کے لئے اللہ تعالیٰ رسول اور اماموں کو متواتر یکے بعد دیگرے بھیجتا ہے۔

تمام ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت ایک رُخ سے بندوں پر اللہ کی رحمت ہے اور دوسرے رُخ سے اللہ کی طرف سے بندوں کی تعلیم و تربیت اور ان کا امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے ذریعے اپنے بندوں کا امتحان ہے کہ کون اس ہدایت کو قبول کرتا ہے اور کون اس کا انکار کرتا ہے! اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے کہ اگر وہ چاہتا تو سب لوگ ایمان لے آتے لیکن اللہ نے انسان کو فطرتاً مجبور پیدا نہیں کیا اور یہ بات مقصدِ تخلیقِ انسان ہی کے منافی ہے، اس طرح نہ انسان کی تربیت و ترقّی کی کوئی گنجائش ہے نہ جزا و سزا کا جواز نہ ہدایت و گمراہی کے کوئی معنی۔ اللہ تعالیٰ رسولوں کے ذریعے اپنا پیغام ہدایت لوگوں تک پہنچاتا ہے اور لوگوں کو شعور و تمیز سے نوازا اور ایک محدود لیکن وسیع

دائرہ میں عمل کی آزادی دی۔ دعوتِ رسالت لوگوں کا امتحان ہے جو عقلِ سلیم سے کام لیتے ہیں وہ اس دعوت پر لبیک کہہ کر ہدایت کو قبول کر لیتے ہیں مگر جن کی طبیعت میں کجی ہوتی ہے وہ ہدایت کا انکار کر کے رجسِ شرک میں گرفتار رہتے ہیں۔ اسی ذیل میں ایک اور زبردست حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ دین میں کوئی اکراہ یا جبر نہیں ہے۔ در اصل دین اور جبر و اکراہ کا ساتھ ممکن ہی نہیں ہے اس لئے کہ زبردستی یا اکراہ کے ذریعے صرف انسان کی زبان پر قابو پایا جاسکتا ہے اس سے قلب کی کیفیت کو نہیں بدلا جاسکتا جبکہ دین کا تعلق قلب سے ہے محض زبان سے نہیں۔ کسی ظالم کا جبر اس فطرت کو نہیں بدل سکتا جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس اعتبار سے لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ محض ایک حکم نہیں ہے ایک بنیادی حقیقت کا بیان ہے۔ انسان اپنے اختیار اور ارادے سے دین کو قبول کرتا ہے اور جب انسان دین کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر اس دین کے اوامر و نواہی کی پابندی ایک ایسے جبر کی حیثیت رکھتی ہے جسے اس نے خود اختیار کیا ہے۔

قَالُوْا مَاۤ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَاۤ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾

(وہ کہنے لگے تم تو ہم جیسے ہی بشر ہو اور رحمٰن نے کچھ نازل نہیں کیا ہے، تم تو محض جھوٹ بولتے ہو)۔

بستی کے لوگوں نے رسولوں کی تکذیب کی تو اس کے لئے یہ دلیل پیش کی کہ تم نہیں ہو مگر ہم جیسے بشر اور نہ تم پر رحمٰن نے کوئی شے نازل کی ہے۔

ہر رسول کی تکذیب کرنے والوں نے یہی استدلال کیا ہے کہ یہ جو رسالت کا دعویٰ کر رہا ہے یہ ہمیں جیسا بشر ہے اور ہم سے تو اللہ کا کوئی براہ راست رابطہ نہیں تو پھر ہم جیسے بشر پر کیسے کوئی وحی نازل ہو سکتی ہے۔ اس لئے رسول اپنے دعوئ رسالت

میں جھوٹا ہے۔ تکذیبِ رسالت کرنے والوں کا یہ استدلال اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ رسالت کے وظیفہ کا شعور نہیں رکھتے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ چونکہ رسول لوگوں کی ہدایت کرنے پر مبعوث ہوا ہے اور وہ انسانی زندگی کا اسوہ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس لئے رسول کا بشر ہونا اس کے منصبِ رسالت کا تقاضا ہے۔ ان کی نظر صرف ظاہری تشابہ پر ہے لیکن وہ اس حقیقت کا شعور نہیں رکھتے کہ ہر انسان کیفیت کے اعتبار سے دوسرے انسان سے کتنا مختلف ہوتا ہے۔ دُنیا میں کوئی دو چیزیں اتنی مختلف نہیں ہوتیں جتنا ایک انسان دوسرے انسان سے مختلف ہوتا ہے۔ اعلیٰ علیین سے اسفل السافلین تک انسانیت کے بے شمار مدارج اور مراتب ہیں۔ اس لئے رسول کو خود پر قیاس کرنا حفظِ مراتب کو نظر انداز کرنا ہے۔ رسولؐ کو خود جیسا بشر کہہ کر اس کی رسالت کا انکار کرنا نہ صرف عظمتِ رسالت کا انکار ہے بلکہ خود انسانی شرف کا بھی انکار ہے انسانیت کے بلند مدارج کا تصور اللہ میں یقین کے بغیر قایم نہیں ہوتا، عبدیت ہی تو انسانیت کی معراج ہے، اللہ کے تصوّر کے بغیر تو نظر پست اور حقیر مخلوق ہی کی طرف جاتی ہے۔ خود حضورؐ کو حکم ہوا کہ آپ فرما دیجئے کہ میں تمہاری طرح مثل بشر ہوں مجھ پہ یہ وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے پس جو کوئی اپنے رب کی مُلاقات کا اُمیدوار ہو اسے چاہیئے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ اسی طرح دوسرے رسولوں نے بھی اپنے بشر ہونے کا اعلان کیا ہے۔ رسول اگر اپنے بشر ہونے کا اعلان کرے تو یہ کلام حق اور اثباتِ حق ہے اگر رسول اور رسالت کی تکذیب کرنے والے رسول کو خود جیسا بشر کہیں تو یہ کلمۂ کفر ہے۔ اصل اہمیت قول کی نہیں ہے بلکہ نیت کی ہے کہ وہی قول کے معنی ہیں۔ کلام پاک میں ایک موقع پر کہا گیا ہے کہ منافق یہ کہتے ہیں کہ تم اللہ کے رسول ہو بے شک اللہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ تم اس کے رسول ہو، مگر منافق جھوٹے ہیں۔ انکار دو حقیقتوں

کا ہے ایک اس بات کا کہ کسی بشر کی رسائی اللہ تعالیٰ تک ہو، دوسرا اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ کسی بشر پر کچھ نازل کرے۔

انسانِ کامل کو کوئی اساطیری ہستی بنا دیتے ہیں یا نور اور بشر کی بے معنی بحثوں میں لگ جاتے ہیں۔ خاص طور پر اہلِ عرب کے لئے یہ ماننا مشکل تھا کہ خدائے رحمٰن اپنے کسی بندے کو براہِ راست وحی سے سرفراز فرما سکتا ہے۔ اہلِ عرب ایک رب الارباب کے قائل تو تھے مگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ رب الارباب اس بات سے بہت بلند ہے کہ وہ خود دُنیاوی اُمور کی طرف توجہ کرے اس لئے اس نے امورِ دُنیا کی دیکھ بھال دیوتاؤں اور دیویوں کے سپرد کر دی ہے۔ انسانوں کا رابطہ اور واسطہ انہیں خداؤں سے ہے۔ اس واسطہ کو توڑ کر رب الارباب کسی بندے پر وحی کر سکتا ہے یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

ایک نکتہ یہ ہے کہ مکذبین و مشرکین نے دعویٰ رسالت کی تکذیب کی۔ حضورؐ کو شاعر کہا، سحر زدہ کہا لیکن کاذب نہیں کہا۔ حضورؐ کو تو تمام اہلِ مکّہ صادق اور امین ہی کہتے تھے۔

قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾

(انھوں نے کہا ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم بیشک اسی کے بھیجے ہوئے ہیں اور ہمارے ذمّہ تو بس واضح طور پر اللہ کے پیغام کو پہنچانا ہے)۔

لوگوں کے انکارِ رسالت کے جواب میں رسولؑ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم اس کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ اس میں ایک بات تو یہ ہے کہ رسول اللہ کی طرف سے مامور ہوتا ہے اور اسی کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔ اس کے تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اس لئے وہ لوگوں کی تصدیق یا تکذیب سے قطع نظر محض اس

بات پر نظر رکھتا ہے کہ جس اللہ نے اسے منصبِ رسالت پر فائز کیا ہے وہ اس کے دعویٰ کا گواہ ہے۔ مزید یہ کہ اس قول میں تاکید کی شان ہے جو تقریباً قسم کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر رسول اپنے دعویٰ میں غلط ہے تو اس کا مواخذہ اللہ خود کرے گا لیکن اگر رسول کی تکذیب کرنے والے غلط ہیں تو وہ بھی اللہ کے مواخذہ سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یہ وہ بات ہے جو مومنِ آلِ فرعون کی زبان سے بھی کہلوائی گئی ہے۔

اس کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ رسول کا کام صرف بلاغ مبین ہے۔ بلاغ مبین کی پہلی صفت یہ ہے کہ جو بات کہی جائے وہ لوگوں کی زبان میں لوگوں تک صاف اور واضح طور پر دلیل و برہان کے ساتھ پہنچ جائے۔ حضرت موسیٰؑ کو جب فرعون کی طرف پیغام پہنچانے کے لئے کہا گیا تو اس وقت آپؑ نے جو دُعا فرمائی اس میں فصاحت اور حسنِ زبان و بیان کا خاص طور پر ذکر ہے۔ بلاغ مبین کی دوسری صفت یہ ہے کہ جو بات کہی جائے وہ عملی صورت میں ظاہر کی جائے۔

بلاغ مبین کی تیسری صفت استقلال ہے۔ یعنی پیغام بار بار پہنچایا جائے یہ تواصوا بالحق کی منزل ہے۔

بلاغِ مبین کی چوتھی صفت صبر ہے۔ صبر کے بغیر کارِ تبلیغ انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اسی لئے ہر نبی اور ہر ولی کے لئے صبر ایک لازمی صفت ہے۔ تواصوا بالحق کے ساتھ تواصوا بالصبر بھی ضروری ہے

اور بلاغِ مبین کی ایک اور صفت یہ ہے کہ اس میں طاقت کا استعمال نہیں کیا جاتا۔

قَالُوٓا إِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۖ لَئِن لَّمْ تَنتَهُوا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٨﴾

(وہ بولے تمہارا آنا ہمارے لئے شگونِ بد ہے اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کریں گے

اور ہماری طرف سے تمہیں دردناک عذاب پہنچے گا)۔

بستی کے لوگوں نے رسولوں سے کہا کہ ہم تمہیں بدشگون سمجھتے ہیں۔ لوگ پرندوں سے شگون لیتے تھے اِس لئے تطیرنا کے معنی شگون لینا ہو گئے۔

یہ شکایت ہر قوم نے اپنے پیغمبرؑ سے کی کہ ان کی دعوتِ رسالت کے نتیجہ میں معاشرہ کا امن اور سکون درہم برہم ہو گیا۔ اہلِ عرب کو خاص طور سے رسولؐ سے یہ شکایت تھی کہ آپؐ کی دعوت کے نتیجہ میں ان کی قوم میں انتشار ظاہر ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کی دعوت انقلابی دعوت ہوتی ہے جس کا نتیجہ معاشرے کے مروجہ رسوم و عقائد اور اداروں کا زیر و زبر ہوتا ہے۔ اس لئے دعوت رسالت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے میں ہیجان اور اضطراب پیدا ہو۔ وہ لوگ جو دولت، طاقت اور اقتدار پر قابض ہوتے ہیں۔ وہ قدیم رسوم و عقائد اور اداروں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ چونکہ دعوتِ رسالت سے ان کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے۔ اس لئے تمام ظالم اور مراعات یافتہ طبقے رسول کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ عوام جو غفلت کا شکار ہیں اور جو معاشرے کے مروجہ نظام سے اس قدر چمٹے ہوتے ہیں کہ ان کے لئے کوئی تبدیلی خوش آئند نہیں ہوتی وہ بھی دعوتِ رسالت کا انکار کرنے والوں میں شامل ہو جاتے ہیں گویا مخالفت کا سبب مفاد پرستی ہے یا توہم پرستی۔

ابتداءً دعوتِ رسالت کو صرف وہ لوگ قبول کرتے ہیں جن کا تعلق مراعات یافتہ طبقے سے نہیں ہوتا اور جو سادہ دل ہوتے ہیں۔ اسی لئے مخالفین کی طرف سے ایسے ایمان لانے والوں کو از راہ حقارت سفیہ کہا جاتا ہے۔

دعوتِ رسالت کے نتیجہ میں ایسے لوگوں کا پہلا ردِّ عمل استہزاء ہوتا ہے۔ پہلے رسول اور اس کے ساتھیوں کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ پھر تہدید و تخویف کی

منزل آتی ہے۔ پھر مصالحت کی پیش کش کی جاتی ہے۔ مصالحت کی پیشکش کا مطلب دعوتِ رسالتؐ کے انقلابی پہلو کو کمزور کرنا ہوتا ہے۔ حضورؐ کو بھی مصالحت کی پیشکش کی گئی کہ ہم آپؐ کے ایک خدا کو مانے لیتے ہیں آپؐ ہمارے بُتوں کو بُرا نہ کہیئے۔ مطلب یہ تھا کہ معاشرہ جس نہج پر چل رہا ہے چلتا رہے اور اسلام جو انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے اسے روک دیا جائے۔ عہدِ حاضر میں بھی اسلامائزیشن کی کوششیں کم و بیش یہی نوعیت رکھتی ہیں جب مصالحت کی بات ناکام ہو جاتی ہے تو پھر مخالفینِ رسالت کی طرف سے طاقت کا استعمال ہوتا ہے اور جب باطل میدانِ جنگ میں بھی ناکام رہتا ہے تو پھر وہ مُنافقت کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے گویا رسالت کے مخالفوں اور منکرین کا پہلا رَدِ عمل استہزاء پھر ڈرانا دھمکانا، پھر مصالحت کی پیشکش پھر طاقت کا استعمال اور آخری حربہ منافقت ہوتا ہے۔

اہلِ قریہ کی تمثیل اور حضورؐ کے واقعہ میں سب سے بڑی مماثلت یہ ہے کہ دونوں واقعات میں پہلے اہلِ قریہ کی طرف سے رسولوں کی تکذیب کی گئی۔ لیکن نتیجہ کے اعتبار سے انطاکیہ کی طرف رسولوں کا بھیجا جانا عذابِ الٰہی سے قبل اتمامِ حجّت کی حیثیت رکھتا تھا جس کے بعد وہ بستی عذاب کا شکار ہو کر تباہ ہو گئی اور جہاں تک حضورؐ کی دعوتِ رسالت کا نتیجہ ہے تو وہ اس سے بالکل مختلف ہے اللہ نے اس دعوت میں برکت دی اور دین کا پیغام ہر طرف پھیلتا گیا لیکن اس مثال کے ذریعے ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ دعوتِ رسالت کو رد کرنے یا قبول کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی ہم اس حقیقت کا شعور حاصل کر سکتے ہیں کہ تاریخ کے واقعات اللہ کی آیات ہیں۔ اور قوموں کا عروج و زوال کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کے قانون کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

ملّت کی تاسیس رسالت کے قیام کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب تک ملّت میں پیغامِ رسالت کی روح زندہ اور بیدار رہتی ہے ملّت زندہ اور مستحکم رہتی ہے اور جب ملّت اس پیغام کی رُوح کو گم کردیتی ہے وہ زوال اور فنا کا شکار ہوجاتی ہے۔ جب دعوتِ رسالت کا آغاز ہوتا ہے تو قوم کے بڑے لوگ اس پیغام کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کی عظمت کا پیمانہ مقدار کا پیمانہ ہوتا ہے۔ وہ مال اور اولاد کی کثرت کو اپنی طاقت اور بزرگی کی نشانی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی میں کامیابی کا راستہ سُنّتِ آباء کی پیروی ہوتا ہے۔ وہ کسی نئے راستہ کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے اس لئے کہ اس سے ان کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے قوم کے محروم اور کمزور طبقے کے افراد بھی جو اس ظالمانہ نظام کے عادی ہوتے ہیں کسی انقلابی تبدیلی سے خوف زدہ ہوجاتے ہیں اور وہ انہی ظالم اور جابر لوگوں کو جو ان کا استحصال کرتے ہیں اپنا ہمدرد اور محافظ سمجھ کر رسولؐ کی مخالفت میں ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف رسولؐ کی دعوت کے نتیجے میں ایک نئی ملّت کی تاسیس کا عمل شروع ہوتا ہے۔ ابتداءً ایسے لوگوں کی تعداد کم ہوتی ہے اور ان کا تعلق زیادہ تر معاشرے کے کم زور طبقوں سے ہوتا ہے۔ یہ لوگ دعوتِ رسالت کی تکذیب کرنے والوں کے ہاتھوں طرح طرح کی سختی اور مصائب کا شکار ہوتے ہیں۔ اس سختی اور تنگی کے نتیجہ میں یہ لوگ تمام دُنیا سے کٹ کر اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق جوڑتے ہیں اور تضرع اور خشیت اختیار کرتے ہیں اور اس طرح ایمان کی قوّت اور حرارت بڑھتی جاتی ہے۔ یہ اس نئی ملّت کی تعمیر کا دَور ایک طرف سختی اور تنگی کا دَور ہوتا ہے تو دوسری طرف اس سختی اور تنگی کے ردِ عمل میں ایمان کے استحکام اور استقلال کا دَور ہوتا ہے۔ اور جب یہ ملّت اپنی خوابیدہ صلاحیتوں اور ایمانی قوتوں کو بیدار کرلیتی ہے تو اللہ تعالیٰ انعام کے طور

پر اس کی سختی اور تنگی کو فراخی اور کشادگی سے بدل دیتا ہے اور اس ملّت کو دُنیا میں بھی غلبہ اور اقتدار مل جاتا ہے لیکن دُنیا کی دولت اور حکومت اگر اللہ کا انعام ہے تو اس کے ساتھ ہی اس ملّت کا اِمتحان بھی ہے پھر جس وقت دولت اور حکومت کا نشہ بڑھتا ہے تو تضرع اور خشیتِ الٰہی کی کیفیت کم ہوتے ہوتے بالآخر بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ لوگوں کے دل سخت ہو جاتے ہیں اور جب قلوب میں تضرع کی جگہ سختی لے لیتی ہے تو شیطان ان کے بُرے اعمال کو ان کی نگاہوں میں زینت دے دیتا ہے۔ پھر جب لوگ پیغام رسالت کی روح کو فراموش کر دیتے ہیں تو اللہ ان پر ہر طرح کے عیش و عشرت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ لوگ اپنے عیش و عشرت میں پھنس کر اپنی حقیقت اور رسولؐ کی نصیحت کو یکسر بھلا دیتے ہیں۔ وہ اپنی فراخی اور کشادگی اور اپنے راحت و آرام میں مگن رہتے ہیں انہیں ان باتوں کا خیال تک نہیں آتا جس سے ان کو ڈرایا گیا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا امر نافذ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ظالم قوموں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے کہ یہی اس کی ربوبیت کی شان ہے۔

گویا ایک ملّت کی تاریخ دعوتِ رسالت سے شروع ہوتی ہے اس کا ابتدائی دور سختی اور آزمائش کا دور ہوتا ہے۔ اس آزمائش کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس ہدایت اور نصیحت پر محکم ہو جائیں جو ان تک رسولؐ کے ذریعے پہنچائی گئی ہے۔ اس سختی اور امتحان سے کامیابی سے گزرنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس ملّت پر انعام و اکرام کرتا ہے اور اسے دولت اور حکومت حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر لوگوں کے دل سخت ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ شیطان کے جال میں پھنس کر رسولؐ کی نصیحت کو بھولنے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر مزید عیش و عشرت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ لوگ اپنی خوش حالی میں اس قدر مگن ہو جاتے ہیں کہ انہیں رسول کی نصیحت بالکل یاد نہیں رہتی۔ پھر اچانک اللہ انہیں پکڑ لیتا ہے اور وہ تباہی اور بربادی کا شکار ہو جاتے

ہیں۔ تمام قوموں کے عروج و زوال کی داستان انہی خطوط پر مرتب ہوتی ہے۔

قَالُوْا طَآىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

(رسولوں نے کہا تمہاری بدشگونی تمہارے ساتھ ہے، کیا جب تمہیں نصیحت کی جاتی ہے (تم اُسے بدفال سمجھتے ہو) حقیقت یہ ہے کہ تم حد سے گزرنے والی قوم ہو)۔

جب بستی کے بڑے لوگوں نے اس انقلابی ہیجان کو جو دعوتِ رسالت کا لازمی نتیجہ تھا رسولوں کی لائی ہوئی نحوست قرار دیا اور انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دے کر آوازِ حق کو دبانے کی کوشش کی تو اس کے جواب میں رسولوں نے کہا کہ تم جسے نحوست کہتے ہو یہ خود تمہارے ظلم اور زیادتی کا نتیجہ ہے تم حد سے بڑھنے والی قوم ہو۔ ہم تمہیں نصیحت کر کے اور راہِ ہدایت دکھا کر تمہارے فائدے کی بات کر رہے ہیں اور تم اس کے جواب میں ہمارے ساتھ سختی اور زیادتی سے پیش آ رہے ہو یہ خود تمہارے مسرف ہونے کی دلیل ہے۔ ہر معاشرے کے فرعون، ہامان اور قارون اس معاشرے میں بلند ہونے والی آوازِ حق کو دبانا چاہتے ہیں۔ ہر ظالم یہ سمجھتا ہے کہ وہ طاقت کے ذریعے آوازِ حق کو دبا سکتا ہے لیکن آوازِ حق کو دبانا کسی ظالم کے بس کی بات نہیں ہے اس لئے کہ جب آوازِ حق کو دبایا جاتا ہے حق کی نصرت اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ یَّسْعٰى قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾

(شہر کے مضافات سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور اس نے کہا اے قوم! مرسلین کا اتباع کرو جو تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے اور جو خود ہدایت یافتہ ہیں)۔

اقصیٰ المدینہ کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ یہ شخص معاشرے کے کم زور اور محروم طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ شہر کے بیچ رہنے والے بڑے لوگ تھے۔ یہ شہر کے مضافات کا رہنے والا

تھا۔ روایتوں میں اس شخص کا نام حبیب نجار بتایا گیا ہے۔ اسے مومن آلِ یٰسین کہتے ہیں۔ اسی طرح قرآن نے ایک اور مومن کا ذکر کیا ہے جسے مومن آلِ فرعون کہا جاتا ہے۔

یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ حضورؐ نے تین ہستیوں کے متعلق فرمایا کہ یہ تینوں مومنِ صادق ہیں۔ مومن آلِ یٰسین، مومنِ آلِ فرعون اور امیرالمومنین علی ابن ابیطالبؑ۔

مومنِ آلِ یٰسین نے رسولوں کی تائید و نصرت کی اس وقت جب بستی کے تمام لوگ ان کی تکذیب کر رہے تھے۔

مومنِ آلِ فرعون نے حضرت موسیٰ کی مدد کی اس وقت جب فرعون اور اس کے امراء ان کے قتل کا منصوبہ بنا رہے تھے۔

اور حضرت علیؑ نے رسول کی دعوت پر لبیک کہا اس وقت جب دعوتِ ذوالعشیرہ میں تمام لوگ خاموش تھے اور بعض آپ کی دعوت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ رسولؐ کی دعوت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے وہ اللہ کی طرف سے تمام انسانیت کو دعوت دیتا ہے اور جو شخص اس وقت جب اس آوازِ حق پر کوئی لبیک کہنے والا نہ ہو بلکہ لوگ استہزاء کر رہے ہوں رسول کی آواز پر لبیک کہتا ہے وہ تمام انسانیت کی نمائندگی کرتا ہے حضرت علیؑ نے دعوتِ ذوالعشیرہ میں رسولؐ کی آواز پر لبیک کہہ کر نہ صرف آپ کی تصدیق کی بلکہ اس بارِ رسالت کو اٹھانے میں شریک ہوگئے جس کے بوجھ سے حضورؐ اپنی پشت پر گرانی محسوس فرما رہے تھے۔

ان تینوں مومنوں میں مومن آلِ فرعون نے اپنے ایمان کو چھپایا کیونکہ اسی طرح وہ حضرت موسیٰؑ کی مدد کر سکتا تھا اور انہیں فرعون اور اس کے امراء کے شر سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ جبکہ مومن آلِ یٰسین اور حضرت علیؑ نے اپنے ایمان کو کھلم کھلا ظاہر کیا کیونکہ اسی طرح وہ رسالت کی تصدیق اور نصرت کا فرض ادا کر سکتے تھے۔ اس

سے ہم دین میں تقیہ کا صحیح مفہوم سمجھ سکتے ہیں۔ یعنی اگر دین کی خدمت اور اس کا مفاد اس بات کا تقاضا کرے کہ مومن اپنے ایمان کو چھپائے تو یہ تقیہ کا صحیح محل ہے۔ اس کے برعکس جیسا کہ اس تمثیل میں بیان کیا گیا ہے کہ جب بستی کے لوگ رسولوں کی تکذیب کر رہے تھے تو مومنِ آلِ یٰسین کے لئے یہی ضروری تھا کہ وہ کھلم کھلا ان کی تصدیق کرے۔ اسی طرح دعوتِ ذوالعشیرہ میں جب آوازِ حق پر کوئی لبیک کہنے والا نہ تھا مفادِ دین کا تقاضا یہی تھا کہ حضرت علیؑ واشگاف لفظوں میں اپنی حمایت اور نصرت کا اعلان کریں۔

مومنِ آلِ فرعون کی مثال کی روشنی میں ہم تقیہ کے صحیح محل کو سمجھ سکتے ہیں اور پھر اسی روشنی میں ایمانِ ابوطالبؑ کے مسئلہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ معیار یہ ہے کہ دین کی خدمت کسی خاص موقع پر دین کو ظاہر کرنے میں ہے یا چھپانے میں۔

مومنِ آلِ یٰسؔ رسولوں کی دو صفات کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرتا ہے جو کہ ان کی سچائی کی دلیل ہیں۔

ایک یہ ہے کہ اس بلاغ میں ان کا کوئی مفاد یا غرض شامل نہ ہو، جس بات میں کہنے والے کی کوئی غرض یا مفاد شامل نہ ہو وہ بات حق ہی ہوتی ہے، دوسری یہ کہ کہنے والا جو کچھ کہہ رہا ہے وہ خود اس کا عملی نمونہ ہے، ہدایت یافتہ ہے۔

مومنِ آلِ یٰسؔ کے کردار کی روشنی میں ہم ایمان کی حقیقت، اس کے تقاضوں اور اس کے اثرات کو سمجھ سکتے ہیں۔ ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی بنیاد قلبِ سلیم اور بصیرت پر ہوتی ہے۔ مومنِ آلِ یٰسؔ اس بات کو سمجھ کر کہ رسول اپنی رسالت کی کوئی اُجرت طلب نہیں کرتے، اور وہ خود ہدایت یافتہ ہیں ان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس تصدیقِ رسالت کے نتیجہ میں اس کے شعور کی سطح بدل جاتی ہے۔ رسالت کا انکار کرنے والوں کا ردِ عمل ان کے مفاد سے مربوط ہے وہ رسالت کو نحوست سمجھ کر خود کو اس کے اثرات سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ جبکہ یہ ایمان لانے والا اپنے نفع و ضرر سے بے نیاز اپنی فطرتِ سلیم کے تحت حق

اور باطل کے فرق کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بالآخر اس کا نفع (فلاح) حق کی پیروی میں ہے۔ جب حق اور باطل کے درمیان تصادم اور محاذ آرائی کی صورت پیدا ہوتی ہے تو اس کے لئے ممکن نہیں رہتا کہ وہ حق کی نصرت نہ کرے۔ دراصل جس وقت حق کا داعی اعلاء حق کی وجہ سے تکلیف میں گرفتار ہو اس وقت اس کی نصرت فرض ہو جاتی ہے اور کسی ایسے شخص کے لئے جس کے قلب میں شعورِ حق بیدار ہو چکا ہو یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ایسے وقت میں نمائندۂ حق کی نصرت نہ کرے۔ مومنِ آلِ یٰس دوڑتا ہوا آتا ہے گویا وہ اپنی تمام قوتوں کے ساتھ رسولوں کی مدد کے لئے سعی کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف آجائیں۔ اس کے دل میں دوسروں کو عذاب سے محفوظ رکھنے کی تڑپ پیدا ہوتی ہے اس لئے وہ کہتا ہے کہ اے کاش میری قوم کے لوگ دیکھ سکتے کہ میرے رب نے مجھے کیسے اکرام سے نوازا ہے۔ لوگوں کے لئے یہ رحم و محبت کا جذبہ اہلِ ایمان کی خاص نشانی ہے۔

گویا ایمان قبول کرنے کے لئے بصیرت اور قلبِ سلیم کی ضرورت ہوتی ہے! ایمان کو قبول کرنے کا لازمی نتیجہ نصرتِ حق اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ ایمان کا تقاضا خلوص ہے اور اخلاص بندگی کی شان یہ ہے کہ انسان جنّت کی طمع یا دوزخ کے خوف سے بے نیاز ہو کر حق کی خدمت اور نصرت کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اس راہ میں استقامت کا مظاہرہ کرتا ہے اور اپنے دشمنوں کے لئے اُس کے دل میں نفرت اور کینہ کی جگہ محبت اور رحم کا جذبہ ہوتا ہے۔ امام حسینؑ وقتِ آخر بھی جو اپنی نصرت کے لئے آواز بلند کر رہے تھے اس کا مقصد یہی تھا کہ اگر کسی کے دل میں نصرتِ حق کا جذبہ خوابیدہ ہے تو اسے جگا دیا جائے اور یہ کہ لوگ آپ کے قتل سے باز آجائیں تاکہ وہ اس عذاب سے بچ سکیں جو آپ کے قتل کا لازمی نتیجہ ہے ورنہ اگر چند لوگ آپ کی نصرت پر آمادہ بھی ہو جاتے تو کیا جو کچھ ہونے والی بات تھی وہ ٹل جاتی، اور یہ صدائے استغاثہ اس وقت

بلند ہوتی ہے جب تمام عزیز و انصار شہید ہو چکے ہیں۔

یہ مسئلہ بہت اہم ہے کہ حق کو قبول کرنے یا رد کرنے کے نتیجہ میں انسان کے فکر و عمل پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس کی زندگی میں اس سے کس نوعیت کی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ حق کو علیٰ وجہ بصیرت قبول کیا جاتا ہے۔ جب انسان یہ شعور و بصیرت حاصل کر لیتا ہے کہ وہ حق کو باطل سے جُدا کر کے دیکھ سکے تو پھر وہ اپنے ذاتی سود و زیاں کی قید سے آزاد ہو کر حق کو محض اس لئے قبول کرتا ہے کہ وہ حق ہے۔

جو شخص حق کو حق کے لئے قبول کرتا ہے وہ اپنے نفع و نقصان کے تصوّر سے بے نیاز ہو کر نتیجہ کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ یہ شعور رکھتا ہے کہ انسان کا فریضہ اور اس کی سعادت یہ ہے کہ وہ حق کو قبول کرے۔ اس قبولِ حق کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا یہ بات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور اجر دینے والا ہے۔

قبولِ حق کے نتیجہ میں انسان کے دل میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایسا انسان حق کے استقلال اور فروغ کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت تو یہ کہ ایسا انسان اگر یہ دیکھتا ہے کہ حق کے نمائندے اور علم بردار لوگوں کے ہاتھوں کسی سختی اور مصیبت کا شکار ہیں تو وہ ہر ممکن طریقے سے ان کی مدد کرتا ہے اور اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے دوسروں تک حق کا پیغام پہنچاتا ہے کیونکہ اس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ اس کی طرح دوسرے بھی حق کو قبول کر لیں حق کی فطرت میں ظاہر ہونا اور پھیلنا ہے

مومن کے دل میں حق کی مثال ایک بیج کی سی ہے جس طرح بیج میں نشو و ارتقاء کی ایک فطری صلاحیت ہوتا ہے اسی طرح حق کی یہ لازمی صفت ہے کہ وہ بڑھتے، پھلے پھولے۔ حق کی تقدیر یہی ہے کہ وہ غالب آئے۔

دوسری طرف وہ لوگ جو حق کا انکار کرتے ہیں ان کے دل میں تنگی اور سختی ہوتی ہے۔ وہ حق سے ڈرتے ہیں اس لئے پہلے تو ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ حق کو دبا یا مٹا سکیں لیکن جب وہ اپنی اس مذموم کوشش میں ناکام ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اپنی گمراہی کے حصار میں محصور ہو کر خود کو حق کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا یہ حصار تنگ سے تنگ تر ہوتا جاتا ہے۔ ایک طرف حق کا دائرہ پھیلتا ہے تو دوسری طرف باطل کا دائرہ سکڑتا جاتا ہے۔ باطل خود اپنے طریقۂ کار کے نتیجہ میں ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہو کر بالآخر ختم ہو جاتا ہے۔ باطل کی تقدیر ہی یہ ہے کہ وہ مٹ جائے، ختم ہو جائے۔

حق اور باطل کی اس خصوصیت کے پیشِ نظر اب اس بات کو سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ جہاں دلوں میں حق کا یقین ہوتا ہے وہاں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ حق کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اس کے برعکس اگر کسی گروہ میں یہ رُجحان غالب آجائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے خول میں محصور ہو جائے اور اپنے اجتماعات کو ایسا رنگ دے دے کہ اس میں دوسرے شریک نہ ہو سکیں تو یہ رُجحان اور رویّہ خود زوال کی نشانی ہے۔

وَمَا لِيَ لَآ أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٢﴾

(اور مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے)۔

ان آیات میں مومنِ آلِ یٰسٓ کی زبانی یہ بتایا جا رہا ہے کہ اہلِ قریہ کی طرف بھیجے

جانے والے رسول جو دعوت دے رہے تھے وہ یہ تھی کہ لوگ اللہ کے علاوہ دوسرے معبودوں کو پرستش چھوڑ کر اس خدائے واحد کی عبادت کریں جو انسان کا خالق ہے اور جس کی طرف سب کو رجوع کرنا ہے۔ مومنِ آلِ یٰسٓ اہلِ قریہ کو اس دعوت کو قبول کرنے اور ان رسولوں کا اتباع کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اس مرحلہ پر ہم اس اہم اور بنیادی سوال پر غور کر سکتے ہیں کہ کسی دعوت کے حق ہونے یا نہ ہونے کو پرکھنے کی کسوٹی کیا ہے۔ یا یہ کہ وہ کون سے اصول ہیں جو کسی داعی کے اتباع کرنے یا اتباع نہ کرنے کا جواز فراہم کرتے ہیں۔

آقائے طباطبائی کا فرمان ہے کہ کسی داعی کے اتباع نہ کرنے کی جواز کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ قول بھی گمراہ کن ہو اور قائل خود بھی ضال یعنی گمراہ ہو اور دوسری صورت یہ ہے کہ قول تو حق ہو مگر قائل کا اپنے قول پر نہ ایمان ہو نہ عمل۔ اس کی نیت فاسد ہو اور وہ طمع مال و جاہ کا شکار ہو۔

لیکن جب قول بھی حق ہو' اور قائل کا اپنے قول پر ایمان اور عمل بھی ہو۔ اس کی نیت غرض فاسد سے بری ہو اور قائل کید و مکر و خیانت سے پاک ہو تو پھر وہ واجبِ اتباع ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی داعی لوگوں کو اتباع کی دعوت دیتا ہے تو اس کے اس دعویٰ کو دو اصولوں کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ اوّل یہ کہ داعی اپنے قول سے کس کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہے' اللہ کو یا ان بندوں کو جن سے اس کا کوئی مفاد وابستہ ہے اور دوسری بات دیکھنی ہے کہ داعی کے قول کا اس کے عمل سے' اس کی زندگی سے کیسا تعلق ہے۔ بالفاظِ دیگر کسی داعی کے اتباع کے جواز یا عدم جواز کا فیصلہ دو بنیادی اصولوں کی روشنی میں کیا جانا چاہیئے اور وہ دو اصول ہیں علم اور تقویٰ۔

مومنِ آلِ یٰسٓ انہی اصولوں کی روشنی میں رسولوں کے اتباع کی دعوت دے رہا ہے۔

اس نے پہلے رسولوں کے کردار پر گفتگو کی ہے اور اس ضمن میں دو باتیں کہی ہیں یعنی یہ کہ نہ یہ کسی ذاتی غرض کا شکار ہیں اور نہ ان کے قول اور عمل میں کوئی تضاد ہے بلکہ یہ ہدایت یافتہ ہیں۔

اُب ان کے قول کے حق ہونے پر دلیل قائم کی جارہی ہے۔ اور یہ دلیل ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے اور مجھے کیا ہوا کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور جس کی طرف تم سب کو رجوع کرنا ہے۔

اس دلیل کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں مومن آلِ یٰسٓ نے اپنی خلقت کا ذکر کیا ہے اور دوسرے حصے میں اہلِ قریہ کو اس بات کی طرف متوجہ کیا ہے کہ تم سب کو اسی اللہ کی طرف رجوع کرنا ہے۔

ہم اس دلیل کے دونوں حصوں پر الگ الگ غور کریں گے۔

دلیل کے پہلے حصے میں یہ کہا گیا ہے کہ عبادت اس خدا کی کی جانی چاہیے کہ جس نے انسان کو خلق کیا ہے۔ خالق کا یہ حق ہے کہ مخلوق اس کی عبادت کرے اور صرف خالق ہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

اللہ اور بندے کے درمیان سب سے پہلا اور بنیادی تعلق یہی ہے کہ اللہ خالق ہے اور انسان اس کی مخلوق ہے۔ ہر مخلوق کا اپنے خالق سے ایک جبلی رابطہ ہوتا ہے اور ہر مخلوق میں اس کے خالق کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اللہ اور انسان کے تناظر میں اس تعلق کو قرآن نے نفخت فیہ من روحی کے بلیغ استعارہ میں بیان کیا ہے۔ ہر نقش اسی وقت زندہ اور بیدار ہوتا ہے جب اس میں اس کے خالق کی روح میں سے پھونکا جاتا ہے۔ انسان میں نفخ روح کے نتیجہ میں زندگی کی وہ کیفیت عطا ہوتی جو دیگر مخلوقات سے مختلف ہے۔ انسان میں اس کے خالق کی صفات کی جھلکیاں ہیں اور وہ خود آگاہی رکھتا ہے۔ اللہ سے انسان کا یہی تعلق اللہ کی عبادت کو اس کی

فطرت صحیحہ کا تقاضا بنا دیتا ہے اور اسی تعلق کے نتیجہ میں اللہ کی عبادت اور اللہ کے علاوہ کسی اور کی پرستش کی نوعیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔

بت محض ایک ایسا خارجی وجود رکھتے ہیں جس کا انسان کے باطن اور اس کی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بتوں کی پرستش ایسی خارجی اشیاء کی پرستش ہے جو مکمل طور پر انسان سے بیگانہ ہیں! ان میں اور انسان میں کوئی یگانگت، مؤانست یا اتحاد ممکن نہیں ہے۔

اس کے برعکس ہر انسان کا اپنے اللہ سے ایک ایسا باطنی تعلق ہے جس سے زیادہ گہرا اور بامعنی اور کوئی تعلق ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ وہ تعلق ہے جس کی کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ انسان کا خالق ہے اس نے انسان میں اپنی رُوح میں سے پھونکا ہے۔ وہ انسان کے رگِ گلو سے زیادہ قریب ہے، اس کا مقام انسان اور اس کے قلب کے دَرمیان ہے اور یہ قرب کا وہ مقام ہے جس کا بیان ممکن نہیں ہے۔ اللہ اور بندے کے تعلّق میں عمومیت کی شان بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی انفرادیت کی شان بھی ہے، اللہ سے زیادہ ظاہر اور اس سے زیادہ باطن اور کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ تمام عالمین کا رَب ہے لیکن اس کا مقام ہر انسان اور اس کے قلب کے دَرمیان ہے۔

اے ترا باہر کسے رازے دگر ہر گدارا بر درت نازے دگر

اللہ کا ہر بندے سے ایسا اَنفرادی اور قریبی تعلّق ہے جس سے زیادہ اپنائیت، یگانگت اور قربت کا کوئی اور تعلّق تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ کی عبادت اس حقیقت کی عبادت ہے جو ہر انسان سے اس کے ماں اور باپ سے زیادہ قریب ہے اس کے برعکس بُت محض ایک خارجی شے ہے۔ بُت خود کوئی طاقت یا قوت نہیں رکھتے مگر جب انسان بُتوں کی پرستش کرتا ہے تو اپنی طاقتیں اور

صلاحیتیں ان کے حوالے کرتا جاتا ہے اس طرح بُت طاقتور اور انسان کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انسان بتوں سے جس قسم کے فائدے اور نقصان کی توقع کرتا ہے ان کا تعلق بھی خارجی اور مادی اشیاء سے ہوتا ہے مثلاً مال و دولت کی ترقی، دشمنوں کی بربادی وغیرہ کوئی انسان کسی بُت سے کوئی ایسا نہیں کرتا جس کا تعلق اس کی داخلی حقیقت سے ہو جیسے تزکیۂ نفس، اطمینانِ قلب وغیرہ۔

اس کے برعکس اللہ وہ حقیقت ہے جو ہر شے پر قادر ہے۔ ہر طرح کی قدرت، طاقت، غلبہ اور اقتدار صرف اسی لئے ہے۔ انسان میں جو صلاحیتیں اور قوتیں ہیں وہ محض اللہ کی صفات کی جھلکیاں ہیں۔ اللہ کی عبادت انسان کی صلاحیتوں کی ترقی اور تکمیل کا ذریعہ ہے۔ جس قدر انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے اس بات کا اقرار کرتا جاتا ہے کہ تو قوی ہے میں ضعیف ہوں، تو عزیز ہے میں ذلیل ہوں تو غنی ہے میں فقیر ہوں۔ اسی قدر اللہ تعالیٰ اس کے ضعف کو قوّت سے، اس کی ذلّت کو عزّت اور اس کے فقر کو غنا سے بدلتا جاتا ہے۔ جس قدر انسان اپنے ظرف کو اپنے مزعومات سے خالی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسی قدر اس کے ظرف کو پُر کر دیتا ہے جب بندہ اللہ کے حضور اپنے وجود کی نفی کرتا ہے جب وہ اس بات کا خلوصِ دل سے اقرار کرتا ہے کہ تو حی ہے میں میّت ہوں تو اللہ تعالیٰ اسے ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ اس کی حیاتِ دُنیا کو جو موت کی کیفیت ہے حیاتِ طیبہ سے بدل دیتا ہے موت میں سے زندگی برآمد کرنا اللہ تعالیٰ کی شان ہے اور انسان اللہ کی عبادت کے ذریعے حقیقی زندگی حاصل کرتا ہے انسان اللہ کی عبادت کے لئے مجبور ہے لیکن یہ کوئی خارجی جبر نہیں ہے بلکہ یہ اس کی فطرت کا جبر ہے یہ اس محبت، یگانگت اور قربت کا تقاضا ہے جو بندے کو اپنے اللہ سے ہے۔ یہ جبر اختیار سے بلند بلکہ اختیار اور آزادی کا سرچشمہ ہے۔ امیر المومنین علیؑ ابنِ ابی طالبؑ نے فرمایا کچھ لوگ اللہ کی عبادت

جنت کے لالچ میں کرتے ہیں یہ تاجروں کی عبادت ہے۔ کچھ عبادت دوزخ کے خوف سے کرتے ہیں یہ غلاموں کی عبادت ہے اور کچھ اس لئے عبادت کرتے ہیں کہ وہ ہے ہی عبادت کے لائق یہ آزاد بندوں کی عبادت ہے۔ یہ وہ آزادی ہے جو اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے حاصل ہوتی ہے کہ انسان اپنے اللہ کی عبادت کے لئے فطرتاً مجبور ہے۔

مومن آلِ یٰسؔ کا بیان اسی حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ نے مجھے ایسی فطرت پر خلق کیا ہے کہ میرے لئے اس کی عبادت کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہے ہی نہیں۔ دراصل خالق اور مخلوق کے درمیان عبدیت کے علاوہ اور کوئی تعلق ممکن ہی نہیں ہے۔

بتوں کی پرستش کے نتیجہ میں انسان اپنی انسانیت کو ذلیل کرتا ہے۔ بُت خواہ خشت و سنگ کے ہوں یا دولت و اقتدار کے ان کی پرستش کا مطلب ذلت ہے اس کے برعکس اللہ کی عبادت کا حاصل خود انسان کی اپنی صلاحیتوں کی ترقی اور تکامل ہے جس قدر انسان اللہ کے سامنے تذلّل اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسی قدر اسے عزت اور اعتبار عطا کرتا جاتا ہے جس حد تک انسان اپنا تخلیہ کرتا جاتا ہے اللہ کی نعمتیں اس کے ظرف کو پُر کرتی جاتی ہیں یہاں تک کہ بندگی کے اخلاص کی ایک منزل وہ بھی ہے کہ جب انسان کے ہاتھ، اللہ کے ہاتھ اور اس کی آنکھیں بن جاتی ہیں اور بندہ یداللہ اور عین اللہ ہو جاتا ہے۔ آنکھ کا تعلق فہم و بصیرت سے ہے عین اللہ، اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ ہاتھوں کا تعلق معاملات سے ہے۔ یداللہ وہ ہے جو لوگوں سے معاملات میں رضائے الٰہی کا مظہر ہے اللہ سے تعلق کی یہ نوعیت بندگی کے اخلاص کی وہ حد ہے جو خاصانِ خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔

اللہ کی عبادت انسان کی فطرت کا تقاضا ہے بلکہ جبر ہے۔ مومنِ آلِ یٰسین کا یہ قول کہ مالی لا اعبد الذی فطرنی انسان کی فطرتِ صحیحہ کا بیان ہے۔ یہ وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے انسانوں کو خلق کیا ہے اس لئے یہ فطرت تمام انسانوں

میں مشترک ہے۔ مومنِ آلِ یٰسین اسی حقیقت کے پیشِ نظر اپنی فطرتِ صحیحہ سے تمام انسانوں پر حکم لگا رہا ہے کہ آخر انسانوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس اللہ کی عبادت نہیں کرتے کہ جس نے ان کو خلق کیا ہے۔

مومنِ آلِ یٰسین کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اہل العبادۃ میں سے تھا اس کا عقیدۂ توحید محض ایک سی عقیدہ نہیں تھا بلکہ ایک قلبی تجربہ تھا۔ توحید سے زیادہ بدیہی اور عام حقیقت اور کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لیکن یہ وہ عظیم حقیقت ہے جو اللہ کی طرف سے اس کے رسولوں پر وحی کی جاتی ہے۔ گویا توحید وحی کا علم ہے اور اس کا تعلق خارجی علم سے نہیں بلکہ داخلی تجربے سے ہے۔ جو شخص اپنے دل کو ہوا و ہوس سے جس قدر پاک کرے گا اسی قدر اس پر توحید کی حقیقت منکشف ہوتی جائے گی۔

اہلِ بصیرت حقیقتِ موجود کو دیکھ کر معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔ مومنِ آلِ یٰسین کے لئے خود اس کی اپنی خلقت معرفتِ الٰہی کی بیّن دلیل ہے۔ اگر انسان اس حقیقت پر غور کرے کہ وہ شروع میں بھی ایک مُشتِ خاک تھا اور اس کا انجام بھی یہی ہے۔ لیکن اس مُشتِ خاک میں اللہ نے کیسی عجیب صلاحیتیں ودیعت کر دی ہیں۔ انسان کی سمع، بصر، افئدہ، اس کے تعقّل و تفکّر کی صلاحیت اس کا عزم، ارادہ اور خود آگاہی اس کے خالق کی معرفت کی روشن دلیلیں ہیں۔ جو اہلِ بصیرت اور معرفت کے لئے اللہ کی عبادت کا جواز فراہم کرنے کے لئے کافی ہیں۔

لیکن جو انسان ان بدیہی حقیقتوں سے نصیحت حاصل نہیں کرتے اور جو اپنے نفع و ضرر کے بندے ہیں ان کو اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ کی دلیل کے ذریعہ اس طرف متوجّہ کیا جا رہا ہے کہ تمہارا مفاد بھی اسی میں ہے کہ جس کی طرف تمہیں لوٹنا ہے تم اس کی عبادت کرو۔

اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ کے معنی ایک اور طرح بھی کئے گئے ہیں جب انسان پر کوئی ایسا وقت آتا ہے کہ اس کے تمام سہارے معدوم اور تمام اُمیدیں منقطع ہو جائیں تو ایسی

حالت میں انسان کا دل جس سہارے کی طرف رجوع کرتا ہے اس کا نام اللہ ہے۔ وہ جو خدا کے منکر ہیں حالتِ مایوسی میں ان کا دل بھی خدا ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اسی بات کو بطور دلیل پیش کیا جا رہا ہے کہ تم جس کی طرف رجوع کرتے ہو اس کی عبادت کیوں نہیں کرتے۔

اس دلیل الذی فطرنی توحید اور الیہ ترجعون قیامت پر عقیدے کا اظہار ہے۔ اللہ اور یوم آخرت کا عقیدہ یہی وہ دو بنیادی اصول ہیں جو تمام ادیان میں اساس مشترک ہیں اور اسی اساسِ مشترک کو دین قیم کہا گیا ہے۔

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾

(کیا میں اسے چھوڑ کر دوسرے معبود اختیار کر لوں کہ اگر رحمان کی طرف سے مجھ پر کوئی تکلیف آئے تو نہ ان کی سفارش ہی میرے کسی کام آسکے اور نہ ہی وہ مجھے اس سے نجات دلا سکیں۔ اگر میں ایسا کروں تو واضح گمراہی میں پڑ جاؤں گا)۔

اس مرحلہ پر ضمناً یہ تذکرہ نامناسب نہ ہوگا کہ اسلام کے بعض متشدد حلقے انبیاء اور اولیاء سے استعانت طلب کرنے کو اربابِ من دون اللہ کی عبادت کے ذیل میں شمار کر کے شرک قرار دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اللہ کے وہ مخلص بندے جنہیں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کہا جاتا ہے ارباب من دون اللہ سے تعبیر کئے جا سکتے ہیں۔ قرآن نے ارباب من دون اللہ کا ٹھکانہ جہنم بتایا ہے جبکہ ان مخلص بندوں کے لئے یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ انہیں اپنے مخصوص انعام و اکرام سے نوازتا ہے۔ اس لحاظ سے ان مخصوص بندوں کو ارباب من دون اللہ میں شمار کرنا ان کے مراتب سے عدم واقفیت اور سوء ادب ہے۔ اسی طرح یہ وہ بندے ہیں جنہیں اللہ نے شفاعت کا اذن دیا ہے۔ یہ خود بھی ہدایت یافتہ ہیں اور لوگوں کو بھی راہ ہدایت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ یہ لوگوں کو اللہ کے غضب سے ڈراتے ہیں مگر یہ گنہ گار بندوں کی طرف اللہ کی رحمت کو متوجہ کرتے

ہیں۔ یہ وہ بندے ہیں جو رب کی معرفت رکھتے ہیں اور جن کے دل اللہ کے بندوں کی محبت سے سرشار ہیں۔ یہ بندگانِ خدا کی نجات کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ یہ اللہ کے اذن سے بندگانِ خدا کے شفیع ہیں اور یہ اللہ کی رحمت کو اس کے بندوں کی طرف متوجہ کرنے والے ہیں۔ ان کو ارباب من دون اللہ کی صف میں کھڑا نہیں کیا جاسکتا۔

اربابِ من دون اللہ وہ بُت ہیں جو خدائی منصب کو غصب کرنے والے ہیں۔ یہ بُت خواہ شجر اور حجر کے ہوں خواہ دولت، طاقت اور اقتدار کے وہ بُت ہوں جو خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں یہ سب جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ بُت پرستی صرف پتھروں کے بتوں کی پرستش ہی نہیں ہے بلکہ سماجی بتوں کی پرستش بھی ہے۔ ہر سماج میں بُت پرستی کا مظہر تین علامتیں ہیں۔ فرعون، ہامان اور قارون، ہر سماج میں حاکم، اہلِ اقتدار اور اہلِ دولت مل کر اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ بندگانِ خدا کی تقدیریں ان کے ہاتھ میں ہیں لوگوں کے نفع و ضرر پر ان کا اختیار ہے۔ تمام سیاہ و سفید کے مالک وہی ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی جگہ غصب کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انسان کا الٰہ وہی ہے جس سے وہ اپنے اُمید و بیم کو وابستہ کرتا ہے۔ یہ بُت، یہ فرعون اور ہامان اور قارون خدائی کے وہ جھوٹے دعویدار ہیں جو لوگوں کو کسی طرح کا نفع اور ضرر پہنچانے پر قادر نہیں ہیں۔ ان کا اور ان کے پیروکاروں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ یہ خود کو جہنم کے عذاب سے نہیں بچاسکتے تو یہ دوسرے لوگوں کی شفاعت کیا کریں گے بلکہ ان کے متعلق تو یہ کہا گیا ہے کہ جب قیامت میں ان کے متبعین انہیں اپنی گمراہی کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے تو یہ ان سے اپنی برأت یہ کہہ کر ظاہر کریں گے کہ ہمیں تم پر کوئی سُلطان یا اقتدار حاصل نہیں تھا خود تمہارے دلوں میں ایمان کمزور تھا۔

جہاں تک شفاعت کا تعلق ہے شفاعت کا خاص مقام ان بندگانِ خدا کو حاصل

ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے شفاعت کا اذن دیا ہے۔ اور شفاعت کا عام مقام یہ ہے کہ ہر مومن دوسرے مومن کا شفیع ہے۔ ایک مومن کا دوسرے مومن کے حق میں دُعا کرنا بھی شفاعت ہے۔ اللہ کے حضور جن بندوں کی شفاعت قابلِ قبول ہے وہ اس کے ماذون بندے ہیں۔ مگر یہ خود اللہ کی عبادت کرنے والے اور لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے والے ہیں۔ ان کا تو پیغام یہی ہے کہ لوگ اللہ کی عبادت کریں تاکہ وہ اس کے عذاب سے محفوظ رہ سکیں اس لئے کہ اگر خدائے رحمٰن کسی کو سزا دینے کا ارادہ کرے تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت اس کے ارادے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ وہ جھوٹے الٰہ جو خدائی کے دعویدار ہیں۔ جو اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کے نفع و نقصان کے مالک اور ان کی نجات کے ٹھیکیدار ہیں ان میں ہرگز یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ کسی کو خدا کے غضب سے محفوظ رکھ سکیں۔ نہ ان کو اللہ کی طرف سے شفاعت کا اذن دیا گیا ہے اور نہ ان کی شفاعت کسی کے کچھ کام آسکتی ہے۔ وہ لوگوں کو کسی طرح کے ضرر یعنی جسمانی یا روحانی آفت سے نہیں بچا سکتے۔ جو لوگ جھوٹے الٰہوں کی عبادت کرتے ہیں وہ خود کو عذاب کا مستحق بنا لیتے ہیں مگر یہاں رحمٰن کا لفظ استعمال کر کے یہ بتایا جا رہا ہے کہ اگر خدا اپنے بندوں پر عذاب میں تاخیر کرتا ہے انہیں توبہ اور اصلاح کا موقع دیتا ہے تو یہ اس کی رحمت کی شان ہے ورنہ بندے تو اس کے علاوہ دوسرے خداؤں کی عبادت کر کے خود کو عذاب کا مستحق بنا لیتے ہیں۔ بندوں کو اللہ کے عذاب سے اگر کوئی شے بچا سکتی ہے تو وہ خود اللہ کی رحمت ہے۔ جھوٹے خداؤں سے کسی شفاعت کی توقع رکھنا ضلالِ مبین یعنی کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ گویا انسان اگر خدائے واحد کو چھوڑ کر دوسرے الٰہ بنائے اور ان سے اپنی اُمید و بیم کو وابستہ کرے تو یہ خود کھلی ہوئی گمراہی ہے۔

اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾

(پس میری بات سنو کہ بیشک میں تمہارے رب پر ایمان لے آیا ہوں)۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ فَاسْمَعُوْنِ کا خطاب رسولوں سے ہے۔ گویا مومنِ آلِ یٰسین رسولوں سے اپنے عہد کی تجدید کر رہا ہے یا یہ کہ رسولوں کو اللہ کے سامنے اپنے ایمان پر گواہ بنا رہا ہے۔ جبکہ بعض دوسرے مفسرین کے خیال میں فَاسْمَعُوْنِ کا خطاب خود اہلِ قریہ سے ہے یعنی مومن آلِ یٰسین اپنی قوم کو اس طرف متوجہ کر رہا ہے کہ اب یہ رسول تنہا نہیں ہیں بلکہ میں بھی ان کے ساتھ ان کا ناصر اور مددگار ہوں تم ان پر جو کچھ ظلم کر رہے ہو میں انہیں اس سے بچاؤں گا۔ اس لیے کہ اب میرا تعلق تمہاری قوم سے نہیں رہا۔ بلکہ میں اپنے ایمان کی بدولت تمہاری قوم سے کٹ کر ان رسولوں کی قوم میں شامل ہو گیا ہوں۔

رَبِّكُمْ کے معنی بھی دو طرح بیان کیے گئے ہیں۔ یعنی یہ کہ رَبِّكُمْ کی ضمیر اگر رسولوں کی طرف رجوع کر رہی ہے تو اس کا مطلب مومنِ آلِ یٰسین کا یہ اعلان ہے کہ میں اپنی قوم کے جھوٹے خداؤں سے تبرا کر کے اس خدا پر ایمان لایا ہوں جو تمہارا رب ہے۔ دوسری صورت میں اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ رَبِّكُمْ کا خطاب قوم سے ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن آلِ یٰسین اپنی قوم کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کر رہا ہے کہ میں جس خدا پر ایمان لایا ہوں وہ صرف میرا ہی خدا نہیں ہے بلکہ وہی تمام انسانوں کا رب ہے اس لیے وہی تمہارا بھی رب ہے۔ اس قول کے معنی کو سمجھنے کے لیے اس پس منظر کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے جس میں یہ جملہ کہا جا رہا ہے صورت یہ ہے کہ اہلِ قریہ کی طرف سے تشدد شروع ہو چکا ہے اور مومنِ آلِ یٰسین ظالموں کی اذیت پر دعوت الی الحق کا فریضہ ادا کر رہا ہے، قوم اس کو اذیت پہنچا رہی ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ "سنو تو میں جس رب کی عبادت کرتا ہوں وہ تمہارا بھی تو رب ہے"۔

قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۖ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ ﴿٢٦﴾ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ ﴿٢٧﴾

(اس شخص سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا تو اس نے کہا کاش میری قوم بھی (اس بات) کو جان لیتی جس کے سبب مجھے میرے رب نے بخش دیا ہے اور عزت والوں میں شامل کر دیا ہے)۔

گو وضاحت نہیں کی گئی لیکن سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے شہید کر دیا گیا۔

قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ کی تفسیر دو طرح کی گئی ہے (۱) یہ الفاظ "ادْخُلِ الْجَنَّةَ" اس کی قوم "استہزا" کے طور پر کہہ رہی ہے گویا اس کی قوم اس کو شہید کرتی جا رہی ہے اور استہزا کے طور پر کہتی جا رہی ہے کہ "جنت میں داخل ہو" اور وہ قوم کے لئے اپنے درجہ مغفرت و کرامت کے بعد ہدایت کی تمنا کا اظہار کرتا ہے۔ (۲) یا یہ خطاب رب العزت ہے اور ساحت عزت کی آواز ہے۔

کہا گیا ہے کہ اس کے قتل کئے جانے کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ اس کے قتل کئے جانے اور جنت میں داخل ہونے میں کوئی فصل نہیں ہے۔

لوگوں کو اس کے مقام کا علم نہیں ہے لیکن اس کو لوگوں کی بدبختی کا علم ہے، ظلمت سے روشنی کی طرف آنے والا ظلمت کی نفسیات کو جانتا ہے لیکن ظلمت پر اصرار کرنے والا روشنی سے ناواقف ہے۔ اسی لئے ایمان کا تقاضہ رحم و کرم و احسان ہے کہ اس کی نجات ہی نہیں بلکہ سب کی نجات ہو اور کفر کی فطرت قساوت اور ظلم ہے۔

یہ تو وضاحت نہیں ہے کہ مومنِ آلِ یٰسین کے ساتھ کیا ہوا لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ وہ ایک امتحان کی کشمکش سے نکل کر طمانیت قلب اور سلام نعیم اور رضی اللہ اور رضوا عنہ یا راضیۃً مرضیۃً کی کیفیت میں داخل ہو گیا۔

اس تمثیل میں مومن آلِ یٰسین کی شہادت کا ذکر ہے اور پھر اہلِ قریہ کی تباہی کا تذکرہ

ہے مگر قریہ کی طرف بھیجے جانے والے رسولوں کے بارے میں مزید کچھ نہیں کہا گیا، اس کی توجیہ یوں کی گئی ہے کہ ان رسولوں کو اتمام حجت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ انہوں نے اہل قریہ کو دعوتِ حق دے کر اپنا کام مکمل کر دیا۔ بستی والوں نے رسولوں کی تکذیب کر کے اور خود اپنے ہم قوم مومن کو شہید کر کے خود کو عذاب کا مستحق بنا لیا۔ اور مومن آل یٰسین نے اپنی شہادت کے ذریعے اپنے ایمان کی گواہی دے کر خود کو اللہ کے انعام و اکرام کا سزاوار بنا لیا۔

پہلے رکوع میں یہ بتایا گیا تھا کہ رسول کی ہدایت سے وہی فائدہ اُٹھاتے ہیں جو ذکر کا اتباع کرتے ہیں اور جن کے دل میں خشی الرحمٰن بالغیب کی صفت ہوتی ہے۔ مومن آل یٰسین کے واقعہ میں اس آیت کی عملی تفسیر پیش کی گئی ہے اور شہادت کے نتیجے میں عطا کئے جانے والے انعامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک حدیثِ قدسی میں ارشاد ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو بندۂ مومن مجھ سے محبت کرتا ہے میں اس کی طرف بڑھتا ہوں اور جو محبت کی راہ میں آگے بڑھ جاتا ہے اسے اپنی راہ میں شہید کر کے اس کی دیت خود بن جاتا ہوں۔ یہ انعام کی وہ سب سے بلند صورت ہے جسے وَجَعَلَنِی مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔

آقائے طباطبائی نے فرمایا ہے کہ مکرمین کا لفظ کلام پاک میں بہت کم اور مخصوص مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ یہ ملائکہ کرام کاملین فی الایمان اور عباد اللہ المخلصین کا مقام ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جو ایمان اور اخلاص کے کمال کی دلیل ہے۔ استغفار ترقیِ کمالات کا زینہ ہے۔ مغفرت ترقی کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کو دور کر دیتی ہے۔ مومن آل یٰسین کو مغفرت سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اللہ کی رحمت اس کے ساتھ ساتھ ہے اور وہ ترقی کی راہ پر آگے بڑھ رہا ہے یہاں تک کہ وہ مکرمین میں قرار دیا جاتا ہے۔

وَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلٰى قَوۡمِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ مِنۡ جُنۡدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنۡزِلِيۡنَ ﴿۲۸﴾ اِنۡ كَانَتۡ اِلَّا صَيۡحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمۡ خٰمِدُوۡنَ ﴿۲۹﴾

(اور اس کے بعد ہم نے اس کی قوم کے خلاف آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارا اور نہ ہی ہمیں لشکر اتارنے کی ضرورت تھی۔ وہ تو صرف ایک چنگھاڑ تھی پھر وہ سب بجھ کر رہ گئے)۔

قوموں اور افراد کی تقدیر کے فیصلے عالمِ امر میں ہوتے ہیں مگر اس کے اسباب اور جواز عالمِ خلق میں مہیا کئے جاتے ہیں جب کوئی قوم اتمامِ حجّت کے بعد خود کو عذاب کا مستحق بنا لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ کو یہ ضرورت نہیں رہتی کہ وہ انہیں عذاب دینے کے لئے آسمان سے کوئی فرشتوں کا لشکر اتارے بلکہ وہ محض ایک چنگھاڑ ہوتی ہے جس کے نتیجے میں وہ بجھ کر راکھ کے ڈھیر کے مانند ہو جاتے ہیں۔

جب کوئی قوم اتمامِ حجّت کے بعد خود کو عذاب کا سزاوار بنا لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ کو حق ہوتا ہے کہ اس قوم پر جس طرح چاہے عذاب نازل کرے۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی مختلف صورتیں یہ بیان کی گئی ہیں۔ عذاب دن میں بھی نازل ہوتا ہے جب لوگ اپنے لہو و لعب میں مبتلا ہوں، رات میں بھی نازل ہوتا ہے جب لوگ غفلت کی نیند سوئے ہوں، عذاب کی ایک صورت یہ ہے کہ زمین دھنس جائے اور ایک صورت یہ ہے کہ آسمان کا کوئی ٹکڑا گر پڑے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قوم پانی میں غرق ہو جائے عذاب پاؤں کے نیچے سے بھی آسکتا ہے اور سر کے اوپر سے بھی نازل ہوسکتا ہے۔ کسی قوم کا فرقوں میں بٹ جانا بھی عذاب ہی کی ایک صورت ہے۔

کلامِ پاک میں یہ بتایا گیا ہے کہ فرشتے شبِ قدر میں آسمان سے زمین پر اللہ تعالیٰ کا امر لے کر نازل ہوتے ہیں۔ فرشتوں کے نزول کا ذکر دیگر مواقع پر بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ

ان بندگانِ حق کی جو باطل کے خلاف جہاد کرتے ہیں نصرت کے لئے فرشتوں کو نازل کرتا ہے۔

نبوت کی تاریخ میں حضرت موسیٰؑ کا ایک خاص مقام ہے۔ جہاد کی تاریخ آپؑ کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ آپؑ سے قبل جو رسول آئے انہوں نے دعوتِ حق کا فریضہ انجام دیا مگر جب ان کی قوم والوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی تو ان قوموں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست عذاب نازل کیا گیا جنابِ موسیٰؑ کے عہد سے نبی اور اس کے ساتھیوں کو جہاد میں شریک کیا گیا اور اس طرح انسانی عظمت اور شرف کے ایک نئے دَور کا آغاز ہوا۔ باطل کے مقابلہ میں حق کا غلبہ اور قیام اور حق کا انکار کرنے والوں کو سزا دینا درحقیقت اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ یہ انسان کے کمال اور اس کے بلوغِ نظر کی دلیل ہے کہ اسے کارِ الٰہی میں شریک کیا گیا۔ انسان کا باطل کے خلاف جہاد میں شریک کیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان اب اس منزلِ کمال پر آ گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کے ذریعہ پوری ہو۔ اور جب بندہ اپنی تمام توانائیوں کو کام میں لا کر جہاد کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا کام انجام دیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس بندے کی نصرت کو اپنا فرض قرار دیتا ہے اور فرشتوں کے ذریعے اس کی نصرت کرتا ہے۔ جہاد کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ فی سبیل اللہ ہو۔ اس میں انسان کی کوئی ذاتی غرض یا مفاد شامل نہ ہو بلکہ انسان خلوصِ نیت سے اللہ کا کام محض اللہ کی خوشنودی کے لئے انجام دے۔ جب انسانوں کے دو گروہ کسی ذاتی مفاد کے لئے متصادم ہوتے ہیں تو اسے فساد کہا گیا ہے۔ اس کے برعکس جب ایسے دو گروہ برسرِ پیکار ہوں جن میں سے ایک کی جنگ فی سبیل اللہ جہاد ہو ایک حق کے دفاع، دوسرا حق کے انکار کے لئے لڑ رہا ہو تو اس لڑائی کو اللہ کی بہت بڑی نشانی بتایا گیا ہے اور جب حق اور باطل اس طرح صف آرا ہوں تو اللہ تعالیٰ حق کی نصرت کے لئے فرشتوں کے لشکر اُتارتا ہے۔

قومیں اپنی کثرت اور دولت اور علم اور طاقت میں کتنی ہی بڑھی ہوئی ہوں لیکن اپنی سرکشی اور ظلم کے پاداش میں ان کا تباہ ہونا مقدر ہے اور یہ اللہ کے لئے بہت آسان ہے۔

کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کی جو مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) عذاب رات کے وقت نازل کیا جاتا ہے جب لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ نیند کی یہ کیفیت اس غفلت کا استعارا ہے جب لوگوں کا شعور خوابیدہ ہو۔

(۲) عذاب دن کے وقت بھی آتا ہے جب لوگ لہو ولعب میں مشغول ہوں۔ دن کا وقت فضل الٰہی کی تلاش کے لئے ہے جب لوگ اس وقت کو لہو ولعب کے لئے وقف کر دیتے ہیں تو اس کا نتیجہ عذاب الٰہی کی صورت میں بر آمد ہوتا ہے۔

(۳) عذاب کی ایک صورت یہ ہے کہ لوگ اپنے ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو قربان کر دیں۔ وہ صرف ذاتی فائدے اور نقصان کی فکر میں سرگرداں ہوں اور اپنی اجتماعی اور قومی ذمہ داریوں کی طرف کوئی توجہ نہ کریں اجتماعی زندگی کی بقا کا راز اکرام یتیم اور اطعام مسکین ہے۔ جب لوگ ان اجتماعی فریضہ کو یکسر بھلا کر ہمہ وقت اپنے نفع و ضرر کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور اپنی دولت اور اقتدار کے اکتناز میں مشغول رہتے ہیں تو پھر وہ قوم عذاب الٰہی کا شکار ہو جاتی ہے۔

(۴) عذاب کسی ایسی آفت کی شکل میں بھی نازل ہو سکتا ہے جس کا خطرہ محسوس کیا جا رہا ہو اور عذاب کسی غیر متوقع آفت کی شکل میں بھی نازل ہو سکتا ہے۔

(۵) عذاب خود اپنے پاؤں کے نیچے سے ابھر سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ قوم کی حالت منقلب ہو جائے اور کمزور اور پسماندہ طبقہ جو پیروں کے نیچے کچلا جا رہا تھا علم بغاوت بلند کر دے۔

(۶) عذاب کی ایک اور صورت یہ ہے کہ آسمان کا کوئی ٹکڑا سر پہ گر پڑے یعنی کوئی بیرونی قوم غلبہ و اقتدار حاصل کر سکے۔

(۷) عذاب کی ایک صورت یہ ہے کہ لوگ زمین میں دھنس جائیں۔ یہ غفلت اور جہالت کی پستیوں کی طرف رو ہونے کا استعارا ہے۔

(۸) عذاب طوفان اور آندھی کی شکل میں بھی نازل ہوتا ہے۔ یعنی فطرت کے عوامل جیسے پانی اور ہوا جو انسانی زندگی کی بقا کے اسباب مہیا کرتے ہیں انسان کی بداعمالیوں کے نتیجہ میں اس کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انہی عوامل کو جو اسباب حیات ہیں ان کی ہلاکت کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔

(۹) جب قوم آپس کے تفرقہ کا شکار ہو کر گروہوں میں بٹ جاتی ہے تو اس کے زوال اور فنا کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ قوم میں تفرقہ اندازی مرکز عدل سے ہٹنے کے نتیجہ میں ظاہر ہوتی ہے اور جب کسی معاشرے میں عدل کی جگہ ظلم لے لیتا ہے تو وہ قوم عذاب کا شکار ہو جاتی ہے۔

(۱۰) عذاب کی ایک اور صورت یہ ہے کہ قوم اپنی بداعمالیوں کے نتیجہ میں تباہی کے دہانہ پر پہنچ جائے پھر ایک چنگھاڑ اسے فنا کر دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اس کی تباہی کے لئے کسی خارجی عوامل کی ضرورت نہیں رہتی۔

قوموں کے تباہ ہونے کی یہ مختلف صورتیں ہیں لیکن عذاب خواہ کسی شکل میں نازل ہو اس کا بنیادی سبب ایک ہی ہے۔ جب کوئی قوم غفلت کا شکار ہو، وہ تعقل سے کام نہ لے، ہدایت کا انکار کر کے شیطان کا اتباع کرے تو پھر وہ خود پر اللہ تعالیٰ کے قولِ عذاب کو محقق کر لیتی ہے اللہ تعالیٰ جو رحمٰن اور رحیم ہے اپنے بندوں کو مہلت دیتا ہے انہیں توبہ کر کے راہِ راست کی طرف رجوع ہونے کی دعوت دیتا ہے لیکن جب کسی قوم پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو جاتی ہے تو وہ حد آجاتی ہے جہاں سے رجوع ممکن نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس پر جس طرح چاہے عذاب نازل کرے۔ یہ عذاب قوموں کی بداعمالیوں

کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ خدائے رحمٰن کے عدل کا تقاضا ہے کہ وہ ظالموں پر عذاب کرے۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی شان ہی یہ ہے کہ ظالم قوموں کی جڑ قطع کرے۔

سورۃ یٰسین کے پہلے رکوع میں کچھ حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کا اہتمام کرتا ہے، رسولوں کے ذریعے اور کتابوں کے ذریعے۔ مگر لوگ اپنی غفلت اور تکبّر کے سبب اس ہدایت کا انکار کرتے ہیں اس رکوع میں ایسے انسانوں کی دو تصویریں (IMAGES) پیش کی گئی ہیں۔ جو غفلت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ تکبّر کی وجہ سے ان کی ٹھوڑیاں اوپر کو اٹھی ہوئی ہیں، ان کے آگے بھی دیوار ہے ان کے پیچھے بھی دیوار ہے، وہ اپنے نفس سے بھی غافل ہیں اور اس کائنات میں اللہ کی نشانیوں کو دیکھنے سے بھی معذور رہیں ان پر اللہ تعالیٰ کا قولِ عذاب ثابت ہو چکا ہے۔ مگر جو لوگ ذکر کا اتباع کرتے ہیں خدائے رحمٰن سے ڈرتے ہیں ان کے لئے مغفرت اور اجرِ کریم کی بشارت ہے۔

دوسرے رکوع میں اس مضمون کی تمثیل پیش کی گئی ہے۔ پہلے رکوع میں جو تصویریں پیش کی گئی تھیں وہ اہلِ قریہ کی صورت میں زندہ اور متحرک نظر آتی ہیں۔ اس تمثیل کے ذریعے اس نہایت اہم اور گہری حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ قوموں کی تخریب یا تعمیر کن اصولوں پر منحصر ہے۔ ان کی زندگی اور موت کا راز کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو نہایت وضاحت سے پیش کیا گیا ہے کہ لوگ خود پر اللہ تعالیٰ کی حجّتِ عذاب کو کس طرح قایم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی آیات کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کر سکیں۔

اس تمثیل میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب کوئی قوم تباہی کے غار کی طرف بڑھ رہی ہو تو بھی ایسا شخص جس کا قلب بیدار ہو چکا ہے کس طرح ہدایت کے راستے پر چل کر نہ صرف یہ کہ خود کو عذاب سے بچا سکتا ہے بلکہ نصرتِ حق کے ذریعہ مغفرت اور اجرِ کریم کا سزاوار

بن سکتا ہے۔ کوئی انسان اپنی تباہی کو اجتماعی ماحول کا جبر قرار نہیں دے سکتا بلکہ بدترین حالات میں بھی انسان کے لیے ہدایت اور سعادت کا راستہ کھلا رہتا ہے۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِمْ مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٣٠﴾

(کیا ہی افسوس ہے بندوں کے حال پر کہ ان کے اوپر کوئی بھی تو رسول ایسا نہیں آیا جس کی انھوں نے ہنسی نہ اڑائی ہو)۔

کسی عبارت کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے لفظی معنوں کے ساتھ ساتھ سیاق سباق لہجہ اور آہنگ پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ کے ٹکڑے میں اللہ تعالیٰ کی رحیمیت اور اس کی رحمانیت کی ایسی شان پائی جاتی ہے جو لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

اس سے بڑھ کر حسرت کا اور کیا مقام ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کا اہتمام کرے اور بندے اپنے مولا کی طرف سے بھیجی جانے والی ہدایت کا انکار کریں اور ان کے تمرّد کی یہ کیفیت ہو کہ وہ اپنے ہادی اور ناصح کا مذاق اڑاتے ہوں۔

اس سے بڑھ کر حسرت کی اور کیا بات ہوگی کہ لوگ اس رسول کا انکار کریں جو ان پر حد سے زیادہ شفیق ہو جس کا دل ان کے لیے تڑپتا ہو۔ جو ان کے غم میں راتوں کی تنہائیوں میں روتا ہو اور ان کی یہ حالت ہے کہ یہ اس رسول کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ کی تفسیر اس طرح بھی کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ کسی پر حسرت کا اظہار کرے۔ مگر ان لوگوں کی حالت اس قدر افسوسناک ہے کہ اگر کسی پر حسرت کی جا سکتی ہے تو وہ یہ ہیں یا پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مومن آلِ یٰسین کا قول ہے جس میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اہلِ قریہ کی حالت یہ ہے کہ رسول

تو انہیں عذاب سے ڈرا رہے ہیں مگر وہ اپنے انجام سے بے پرواہ ہو کر رسولوں کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ درحقیقت حسرت کرنے والوں کی حسرت کے یہی لوگ مستحق ہیں۔

سید قطب نے اس ضمن میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ جب کوئی جانور بھی کسی راستے پر چلتے ہوئے یہ دیکھتا ہے کہ اس راستے پر اس سے قبل اس کی نوع کا کوئی اور جانور کسی مصیبت کا شکار ہو گیا تھا تو وہ اس راستے سے واپس ہو جاتا ہے لیکن حسرت ہے ان انسانوں پر جو عقل و شعور رکھنے کے باوجود ماضی کی تاریخ سے کوئی عبرت یا نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ ہر دور میں قومیں اسی تباہی کے راستے پر چلتی ہیں جس پر چل کر سابقہ قومیں عذاب کا شکار ہوئیں۔ ہر دور میں انسانوں کے لیے توبہ کے دروازے کھُلے رہتے ہیں وہ آثار گزشتگان پر غور کر کے تباہی کے راستے سے بچ سکتا ہے مگر لوگ اپنی غفلت اور تمرّد کی وجہ سے حقیقت کو نہیں دیکھتے اور ہر دور میں اسی تباہی کے راستے پر چلتے رہتے ہیں۔ انسانوں کی یہی وہ حالت ہے جس پر حسرت کرنے والوں کو حسرت کرنی چاہیے۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۲﴾

(کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ان سے پہلے کئی نسلوں کو ہلاک کر دیا کہ وہ لوگ ان کے پاس ہرگز پلٹ کر آنے والے نہیں ہیں البتہ وہ سب کے سب جمع ہو کر ہمارے حضور حاضر کیے جائیں گے)۔

کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ ہم نے ان سے قبل کتنی قرنوں کو ہلاک کیا اور اب وہ ان کی طرف لوٹ کر نہیں آتے۔

یرجعون کے ایک معنی یہ بتلائے گئے ہیں کہ جو قومیں تباہ کی جا چکی ہیں وہ دولت و ثروت اور خوش حالی میں موجودہ دور سے بہت آگے تھیں اب انکی وہ خوش حالی ان تک

آنے والی نہیں ہے۔

آقائے طباطبائی نے فرمایا کہ یرجعون کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ ہلاک کرتا ہے اب وہ ان مقامات کی طرف جہاں وہ اس دُنیاوی زندگی میں عیش و عشرت کے ساتھ رہتے تھے لوٹ کر آنے والے نہیں ہیں۔

وہ جو عذاب کے ذریعے ہلاک ہوتے ہیں ان کی حالت کو خامدون کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔ یعنی وہ ایک ایسے شعلہ کی طرح تھے جو بجھ کر راکھ ہو گیا۔ یہ فنائے کلی کی کیفیت ہے۔ ان قوموں کا نام و نشان بھی کہیں باقی نہیں ہے۔ تاریخ میں ان کے کوئی آثار زندہ نہیں رہے۔ ان کا اپنی بعد کے آنے والی نسلوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہر قوم میں زندگی کی ایک روایت ہوتی ہے۔ اس روایت کے تسلسل کے نتیجے میں گزرنے والی نسلیں بعد میں آنے والی نسلوں کی صورت میں زندہ رہتی ہیں۔ مگر وہ قومیں جنہیں عذاب کے ذریعے ہلاک کیا جاتا ہے وہ لوحِ تاریخ سے نقش غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں مگر نوشتۂ قدرت میں ان کے اعمال کا حساب باقی رہتا ہے اور انہیں یومِ حساب اپنے رب کے حضور حاضر کیا جائے گا۔ اس مرحلہ پر اس حقیقت کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ یوں تو ہر بندہ ہر لحظہ اپنے رب کی حضوری میں ہے لیکن دُنیا میں اس حقیقت پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ قیامت میں یہ پردہ اُٹھ جائے گا اور تمام انسان خود کو اپنے رب کی حضوری میں محسوس کر لیں گے۔

تیسرا رکوع

اب تک کے مطالعہ کی روشنی میں ہم نے اس حقیقت کو دریافت کیا ہے کہ سورۃ یٰسین کے پہلے رکوع میں ایک حقیقت بیان کی گئی ہے اور دوسرے رکوع میں اس حقیقت کو بطور تمثیل پیش کیا گیا ہے۔

جہاں تک تیسرے رکوع کا تعلق ہے اس میں آیاتِ الٰہی کا ذکر ہے کہ انسان ان پر تفکر اور تعقل کے ذریعے حقیقت کا عرفان حاصل کر کے اپنے لیے راہِ نجات تلاش کر سکے۔ بالفاظِ دیگر اس رکوع میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ اس دُنیا میں جو نورِ الٰہی کی تجلی گاہ ہے انسان کو اپنی زندگی کس نہج پر گزارنی چاہیئے۔ اس کے بعد چوتھے رکوع میں قیامت کا منظر ہے جس میں دُنیاوی زندگی کے نتیجہ اور انجام کو پیش کیا گیا ہے اور پھر آخری رکوع میں تمام مضامین کو سمو کر یکجا کر دیا گیا ہے۔

کلام پاک کو سطحی طور پر پڑھنے والوں کو اس کے مضامین میں ربط اور تنظیم نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس ربط و تنظیم کو منطق کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ لیکن منطق اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود انسان کی زندگی کا ایک حصّہ ہے۔ یہ پوری زندگی پر محیط نہیں ہے جبکہ کلام پاک کا خطاب نفسِ انسانی سے ہے جو منطقی تسلسل کی گرفت سے ماورا ایک ایسی وحدت ہے جو کثرت اور تنوع سے عبارت ہے۔ کلامِ پاک کو سمجھنے کے لیے انسان کو اپنے نفس کو اس کی تمام پہنائیوں اور وسعتوں کے ساتھ آیاتِ الٰہی کے روبرو کرنا ہوتا ہے۔ اور جب انسان اس سطح سے کلام پاک کا مطالعہ کرنے کی سعادت

حاصل کرتا ہے تو اس پر یہ حیرت انگیز حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کلام الٰہی میں مضامین کو جس ربط اور تنظیم کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، بیانِ حقیقت کے لیے اس کے علاوہ کوئی نظم اور ترتیب ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔ اس سورۂ مبارکہ کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے رکوع میں تین مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ دوسرے رکوع میں ایک قوم کی تمثیل ہے! اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسالت کا اقرار یا انکار ہی وہ بنیادی اُصول ہے جس پر قوموں کی بقا اور فنا کا دارومدار ہے، تیسرے رکوع میں زندگی اور فطرت میں آیاتِ الٰہی کا بیان اور ان کے تناظر میں دُنیاوی زندگی میں راہ نجات کا ذکر ہے، اور چوتھے رکوع میں قیامت کا منظر ہے۔ یہ زندگی کی وہ کیفیت ہے جو اس دُنیا کے عمل اور اس کے اثرات کا نتیجہ ہوگی، ان تینوں مناظر کو یکے بعد دیگرے پیش کیا گیا ہے۔ تینوں منظر دعا کے کے ساتھ ختم ہوتے ہیں اور تینوں مناظر میں اس قدر گہرا تعلق اور اس درجہ ترتیب اور نظم ہے کہ اگر انسان ان مناظر کو اپنی لوحِ دل پر مرتسم کر سکے تو وہ یہ محسوس کر سکے گا کہ بیانِ حقیقت کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی ترتیب ممکن ہی نہ تھی۔ گویا مضامین کی یہ ترتیب بیانِ حقیقت کی سب سے بہتر صورت ہے بلکہ یہی وہ واحد ترتیب ہے جس کے ذریعے حقیقت کا بیان ممکن ہو سکتا ہے۔

تیسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات بیان کر کے ان پر تعقل و تفکر کی دعوت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی آیتوں پر تعقل اور تفکر کے لیے انسان کو سماعت اور بصارت دی ہے۔ سماعت کا تعلق عالمِ تاریخ سے ہے اور بصارت کا تعلق عالمِ فطرت سے ہے۔ عالمِ نفس، عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ تینوں آیاتِ الٰہی کے صحیفے ہیں۔ ہر انسان کے نفس میں اس کے ظرف اور توفیق کے مطابق غارِ حرا بننے کی صلاحیت موجود ہے، اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ کوہِ طور کی طرح تجلی الٰہی کی جلوہ گاہ ہے، لوحِ تاریخ کا ہر نقش ایک ایسی کتاب ہے جس میں قوموں کے عروج و زوال کے واقعات، اسباب اور محرکات لکھے ہوئے ہیں۔

لیکن آیاتِ الٰہی کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے سماعت اور بصارت کو زندہ اور بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے ذریعے انسانوں کے سمع و بصر کی تربیت کا اہتمام کرتا ہے۔ یہ رسول ہی ہیں جو آنکھوں کو صحیح معنوں میں دیکھنے اور کانوں کو سننے کے لائق بناتے ہیں اور جب رسول کی تربیت کے فیض سے انسان کی سماعت اور بصارت بیدار ہوجاتی ہے تو پھر اس پر یہ حقیقت منکشف ہوجاتی ہے کہ آیات خواہ وہ صحیفۂ نفس میں ہوں، صحیفۂ فطرت میں ہوں یا صحیفۂ تاریخ میں ایک ہی حقیقت کی نشانی ہیں۔ ان آیات میں وحدت اور ہم آہنگی ہے جو ان کے خالق کی وحدت کی نشانی ہے۔ ان میں ربط و تنظیم ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کی دلیل ہے اور ان میں انسانوں کے لیے جسمانی اور روحانی منفعتیں ہیں جو اللہ کی ربوبیت اور رحمت پر دلالت کرتے ہیں۔ آیاتِ الٰہی پر تفکر کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کی وحدت، قدرت، حکمت اور رحمت کی معرفت ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس دُنیا میں اپنی زندگی کی نہج پر غور کرے۔ یعنی وہ اس بات پر سوچے کہ یہ دُنیا جس کا ذرہ ذرہ اللہ کی آیت ہے اس سے کس قسم کی زندگی گزارنے کا تقاضا کرتی ہے۔

لفظِ آیت کا مفہوم

مفرداتِ راغب اصفہانی میں لفظ آیت کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے اسے ہم اپنے لفظوں میں اس طرح بیان کرسکتے ہیں کہ آیت کا مطلب ہے ایک ایسی علامت جو ظاہر اور واضح ہو۔ آیت ہر اس ظاہر شے کو کہتے ہیں جو کسی ایسی دوسری شے کو لازم ہو جو اس طرح ظاہر نہ ہو مگر جب کوئی شخص اس ظاہر شے کا ادراک کرے تو اس کے ذریعے وہ اس حقیقت تک پہنچ سکتا ہے جو مخفی اور پنہاں ہے۔ آیت ایک علامت ہے جو مخفی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ آیت یعنی ظاہری شے اور اس مخفی حقیقت میں

جس کی طرف وہ اشارہ کرتی ہے ایک جوہری تعلق اور یگانگت ہے اور ان کا حکم ایک ہے اور یہ تعلق اور یہ لزوم محسوسات میں بھی ہے اور معقولات میں بھی ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ کسی مخصوص راستے کی شناخت فلاں نشانی کے ذریعے کی جا سکتی ہے تو اگر کسی نے وہ نشانی تلاش کرلی تو گویا اس نے وہ مخصوص راستہ پالیا۔ بالفاظِ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ راستہ اور نشانی کا حکم ایک ہی ہے۔ ہر آیت خود اپنی جگہ بھی ایک وحدت ہے اور وہ اپنے علاوہ بھی کسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ گویا

(۱) آیت اپنی جگہ ایک شے موجود ہے۔ یہ اس کا ظاہری اعتبار ہے۔

(۲) لیکن وہ اپنے آپ سے گزر کر ایک حقیقت کی طرف اشارہ بھی ہے، یہ اس کی معنویت ہے۔

(۳) یہ اشارہ محض ایک مفروضہ یا مزعومہ اصطلاح نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس حقیقت ہی کی ایک جہت ہے۔

(۴) علامت یا آیت حقیقت کو آدھا چھپاتی ہے اور آدھا ظاہر کرتی ہے۔ گویا آیت حقیقت کا پردہ بھی ہے اور غرفہ بھی ہے۔

(۵) آیت لفظی اور فکری دلیل (راہ بتانے والی) ہے۔

زیر مطالعہ رکوع میں جن آیات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہیں۔ مردہ زمین کا زندہ ہونا۔ زمین سے ثمرات کا اُگنا اور چشموں کا برآمد ہونا۔ رات اور دن کا ایک دوسرے سے برآمد ہونا۔ مخلوقات کا جوڑوں میں پیدا کیا جانا۔ چاند، سورج اور دیگر اجرامِ فلکی کا مقررہ مدار پہ گردش کرنا۔ سمندروں میں سواریوں کا فراہم کرنا۔ جانوروں کا مسخر کیا جانا ان تمام نشانیوں کو اہلِ تقویٰ کے لیے نصیحت اور معرفت کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ ان آیات میں سے بعض کا تعلق عالمِ فطرت سے ہے اور بعض عالمِ نفس سے متعلق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عالم انفس اور عالمِ آفاق میں اس قدر نشانیاں پائی جاتی ہیں

جن کا احصار اور شمار ممکن نہیں ہے۔ کلام پاک میں متعدد مقامات پر جن آیاتِ الٰہی کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

آسمان اور زمین کی خلقت، آسمان کا بغیر کسی ستون کے قائم رہنا، زمین کا اپنے مدار پر گردش کرنا۔ زمین کا نہ اس قدر نرم ہونا کہ انسان اس میں دھنس جائے اور نہ اس قدر سخت ہونا کہ اس پر زراعت اور عمارات کی تعمیر ممکن نہ ہو سکے۔ چاند، سورج اور دیگر اجرامِ فلکی کی تخلیق، ان کی تنظیم، ان کا اپنے اپنے مقررہ مداروں پر گردش کرنا۔ زمین کا پہاڑوں کی میخوں کے ذریعے استحکام۔ اس میں سے درختوں اور پھلوں کا اُگنا، چشموں اور دریاؤں کا جاری ہونا، روشنی، حرارت اور بارش اور ہوا کا نظام اور اس نظام میں ایسا توازن جو زندگی کے لیے مفید اور ضروری ہے۔ بادل جو زمین اور آسمان کے بیچ میں مسخر ہیں، بجلی کا چمکنا، بارش کا ہونا، ہوا کا چلنا، تسخیرِ بحر (اس میں رزق، دولت، زیور، راستہ) لیل و نہار کا تسلسل، موت میں زندگی اور زندگی میں سے موت نکلنا، غرض اس کارخانۂ قدرت کی ہر شے اپنی جگہ ایک آیت ہے اور یہ پورا کارخانۂ قدرت اس کا استحکام، اس کی نظم و ترتیب اور اس کا توازن اس کا قیام، اس کی حرکت و تغیر خود اللہ کی بہت بڑی نشانی ہے لیکن عام طور پر انسان ان آیات پر غور نہیں کرتے البتہ جب اس کارخانۂ قدرت کے نظم و توازن میں کوئی خلل واقع ہوتا ہے، کوئی زلزلہ، طوفان یا آندھی آجاتی ہے تو اسے اللہ کی نشانی سمجھا جاتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس عام نظام میں کوئی خلل واقع نہ ہونا اور اس کا مقررہ نہج پر چلنا بجائے خود بہت بڑی آیت ہے۔

کلام پاک میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے لیکن تسخیر کا یہ مطلب سمجھنا کہ انسان اس کائنات اور اس کی تمام قوتوں کا مالک ہے۔ بہت بڑا فکری مغالطہ اور گمراہی ہے۔ تسخیر کا مفہوم یہ ہے کہ یہ کائنات

ایک قاعدے اور قانون کے تابع ہے۔ کائنات عالم کون ہے فساد نہیں ہے، انسان اس قانون کا علم حاصل کر کے کائنات کی قوتوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرسکتا ہے اس لئے کہ ان تمام قوتوں کا انسان کے فائدے کے لئے مسخر کیا جانا اللہ کی رحمت اور اس کی آیت ہے تسخیر کائنات کا ذریعہ علم ہے، علم طاقت بھی ہے روشنی بھی ہے، تسخیر کائنات میں طاقت ومفاد پر تمام تر توجہ دینے اور نور ومعرفت کے پہلو کو نظر انداز کرنے سے یہ بھی ممکن ہے کہ یہی قوتیں انسان کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اس کی تباہی اور ہلاکت کا موجب بن جائیں اس کے خلاف اسی طرح صف آرا ہوجائیں جیسے خود انسان کے اپنے ہاتھ پاؤں اس کے خلاف گواہی دیں گے کہ کسی شے سے فائدہ اٹھانے میں حدود اللہ کو نظر انداز کرنا اس شے کا استحصال ہے۔ آج فطرت کے استحصال سے یہ خطرہ بھی درپیش ہے کہ ہوا اور پانی جن پر زندگی کی اساس ہے سم آلود ہو کر زندگی کے لیے مہلک نہ ہوجائیں۔

اسی سورۂ مبارکہ میں جانوروں کے انسان کے فائدے کے لئے مسخر کئے جانے سمندر اور دوسرے راستوں میں سواریوں کے فراہم کرنے اور درخت سے آگ کے برآمد ہونے کا بھی ذکر ہے اور یہ وہ تین باتیں ہیں جو انسان کی تہذیبی ارتقاء میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انسانی ارتقا میں پہلا انقلابی قدم آگ کی دریافت ہے، دوسرا قدم جانوروں کو تسخیر کرنا ہے اور تیسرا قدم وہ ہے جس میں سمندر بجائے رکاوٹ کے راستہ بن گیا۔

اسی طرح پرندوں کا ہوا میں قائم رہنا۔ دو مکروہ چیزوں یعنی گوبر اور خون کے بیچ سے دودھ نکلنا اور شہد کی مکھی کا شہد بنانا جس میں لوگوں کے لئے شفا بھی ہے اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ اور اللہ کی ہر آیت اور ہر نشانی صاحبانِ بصیرت کے لیے دعوتِ تفکر ہے۔ انسان ان آیات پر جس قدر غور کرتا ہے اس کی معرفت بھی بڑھتی ہے اور اس کی حیرت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ انسان اس کائنات کے جس راز کو حل کرنا

جا ہتا ہے اس کے پس پردہ اور گہرے راز نمودار ہوتے جاتے ہیں۔ صاحبانِ تقویٰ ہمہ وقت اِن آیات پر تدبر و تفکر کرتے ہیں۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے غرض ہر حالت میں تعقل کرتے ہیں اور اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اے ہمارے رَب تو نے کسی شے کو باطل خلق نہیں کیا۔ اللہ نے اس کائنات کو حق کے ساتھ خلق فرمایا ہے، اس کی ہر شے کو حسین بنایا ہے، اس کے ہر ذرّے میں اس کے خالق کی شان جھلک رہی ہے اِس لیے اس کائنات کا ہر ذرّہ مقدس ہے، ہر شے محترم ہے، ذرہ ذرّہ اپنے رَب کی تسبیح کر رہا ہے۔ ہر شے اپنی جگہ ایک وحدت ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہر شے اپنے خالق کی طرف اشارہ کرنے والی آیت ہے۔

عالم آفاق کی طرح عالم انفس میں بھی اللہ کی آیات ہیں۔ انسان کا آغاز یہ ہے کہ وہ مٹی کا ڈھیر تھا اور انسان کا انجام بھی یہی ہوگا کہ وہ مٹی کا ڈھیر ہو جائے گا۔ مگر انسان کس قدر حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اسے اس قدر آزادی دی گئی ہے کہ وہ اپنے رب کا خصم مبین بھی بن سکتا ہے، اِنسان کی آزادی، اس کا اختیار عزم، ارادہ، شعور اور خود آگاہی یہ سب اللہ کی آیات ہیں۔ مخلوقات کا زوج زوج پیدا کیا جانا اللہ کے احد اور صمد ہونے پر دلیل ہے۔ صرف وہی احد ہے کہ جس کا کوئی کفو نہیں ہے۔ مخلوقات میں زندگی کا نظام زوج زوج ہونے پر منحصر ہے۔ مَرد اور عورت کے درمیان کشش اور موانست اللہ کی آیت ہے۔ رات کو آرام اور دن کو فضلِ الٰہی کی تلاش اللہ کی آیت ہے۔ نیند اور اس کے بعد بیداری بھی آیت ہے، زبانوں اور رنگوں کا اختلاف اور کثرت بھی اللہ کی نشانی ہے۔ رزق کی تنگی اور کشادگی، قلب کی کیفیات، اِنسان کے قلب کا اللہ کی طرف کھنچنا، اس کا اضطراب اور اطمینان، قلب پر مُہر لگ جانا، اور توبہ کا قبول ہونا اللہ کی آیات ہیں، تخلیقِ کائنات میں طاقت، قانون، راستہ، ہدایت، حد اور اندازہ، اس کی تقدیر کی، تدبیری امور میں اس کی حکمت اور رحمت کی، تسخیرِ کائنات

میں اس کی وحدت کی آیات ہیں۔

اسی طرح صحیفۂ تاریخ کے ہر صفحہ پر اللہ کی آیات تحریر ہیں۔ قوموں کا عروج و زوال، ایک گروہ کا دوسرے گروہ کو دفع کرنا، جہاد فی سبیل اللہ یہ سب اللہ کی آیات ہیں۔ قرآن نے سابقہ قوموں کے جو واقعات بیان کیے ہیں وہ محض تاریخ کے واقعات ہی نہیں رہے بلکہ کلام الٰہی کا جزو بن کر اللہ کی آیات بن گئے۔ قرآن میں اُمتِ موسیٰؑ کے جس قدر واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ سب آیاتِ الٰہی ہیں۔ اس مرحلہ پہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ نہ تاریخ حضورؐ کے عہد پہ آکر رک گئی اور نہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سنت بدلی ہے کہ وہ قوموں کے عروج و زوال کے واقعات کو اپنی آیات قرار دیتا ہے۔ بے شک کلام الٰہی کی تنزیل حضورؐ پہ ختم ہو گئی لیکن تاریخ کا تسلسل ختم نہیں ہوا۔ اس لیے اگر اُمتِ موسوی کے واقعات آیاتِ الٰہی ہیں تو اُمتِ محمدی کی تاریخ اور حضورؐ اور ان کی آل کے واقعات بھی اللہ کی آیات ہیں۔ ہر دَور کی تاریخ میں اللہ کی نشانیاں ہیں خود ہمارے دَور کی تاریخ بھی ان نشانیوں سے خالی نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ ہماری آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوں جن کی وجہ سے ہم ان نشانیوں کو دیکھنے سے معذور ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نشانی قرآن کی آیات ہیں اس سے بڑھ کر اللہ کی آیت کیا ہو گی کہ اللہ اپنے بندے کے قلب کا انشراح کر دے اور اس کے بیان کے ذریعے اپنی تجلی کو ظاہر کرے۔ یہ وہ آیت کبریٰ ہیں جو اگر پہاڑوں پر نازل کی جائیں تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ ایک بندے کے قلب کا ان آیات کا متحمل ہونا بذاتِ خود سب سے بڑی آیت ہے۔ حضورؐ کے سفرِ معراج اور ان کے مشاہدات اور برکات اور نعمات بھی اللہ کی عظیم ترین آیات میں سے ایک عظیم آیت ہیں۔

خلاصہ یہ کہ کتابِ نفس، کتابِ کائنات، کتابِ تاریخ اور الکتاب یعنی کتاب اللہ ہر کتاب میں اللہ کی آیات ہیں۔ انسان کے نفس میں اور اس کے چاروں طرف یا اللہ ہے

یا اس کی نشانیاں ہیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں کائنات کی ہر شے اللہ کی نشانی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسی نظریں ہوتی ہیں جن میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ معمولی اشیاء کو آیاتِ الٰہی کے بطور دیکھ سکیں۔

حضورؐ نے فرمایا کہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ گویا مومن کی بصیرت اس سطح پر ہوتی ہے جسے اللہ کے نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ نے فرمایا کہ اگر درمیان کے تمام حجابات ہٹا دیئے جائیں تو بھی میرے یقین میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ یہ مشاہدہ کی وہ منزل ہے جہاں شہود و غیب کی دوئی ختم ہو جاتی ہے۔

اہلِ عرفان حضرت علیؑ سے ایک اور روایت نقل کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ ان جنابؑ نے فرمایا کہ میں نے کوئی شے نہیں دیکھی مگر یہ کہ اس سے قبل، اس کے بعد، اس کے ساتھ اور اس کے اندر اللہ کو نہ دیکھا ہو۔ یہ مشاہدہ کی وہ منزل ہے جہاں انسان کی بصیرت ھُوَ الْاَوَّلُ، ھُوَ الْاٰخِرُ، ھُوَ الظَّاھِرُ، ھُوَ الْبَاطِنُ کی گواہی دیتی ہے۔

گویا اشیاء کو آیاتِ الٰہی کے بطور دیکھنے کی شرط قلب کی بیداری ہے۔ جب انسان کا قلب بیدار ہوتا ہے تو پھر اس کی آنکھیں بھی روشن ہو جاتی ہیں اور جب آنکھیں روشن اور زندہ ہو جاتی ہیں تو ہر شے میں اللہ کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے اور پھر چشم معرفت کے لیے ہر شے اللہ کی آیت بن جاتی ہے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اشیاء کا علم حاصل کرنے کی مختلف سطحیں ہیں اور ان میں سے ہر سطح کا علم اپنی جگہ پر معتبر اور مستند ہے۔

سائنس کے علم کا مقصد فطرت کے قوانین کو دریافت کرنا ہے تاکہ ان قوانین کو اپنے مادی مفاد کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ سائنس کی ابتدا بھی ٹیکنالوجی ہے اور اس کی انتہا بھی ٹیکنالوجی۔ ہر چند سائنس دان اس کائنات میں وحدتِ قانون کے علم بردار ہیں لیکن اس علم کا کوئی مابعد الطبیعاتی یا روحانی پہلو نہیں ہے۔ سائنس دان فطرت کا مطالعہ فطرت کے قوانین کی دریافت کے لیے کرتے ہیں۔ اس مطالعہ کی بُنیاد تجربہ پر ہوتی ہے۔ سائنسی تجربہ باطنی یا روحانی تجربہ نہیں ہے بلکہ ایک معروضی تجربہ ہے جس کے ذریعہ قوانین کی تصدیق کی جاتی ہے۔ یہ تجزیہ اور تحلیل کے ذریعے اشیاء کی فعلیت دریافت کرنے کا علم ہے۔ اس علم میں معلومات کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑ کر وحدتِ قانون کو دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ غیر شخصی علم ہے جس میں ذہن اور موضوع کے درمیان یگانگت نہیں پیدا ہونے پاتی۔ علم کے دائرے میں بہت وسعت اور اضافہ ہوتا ہے جس میں حیرت انگیز قوت اور آسانی بھی پیدا ہوتی ہے لیکن شعور کی سطح نہیں بدلتی۔ یہ علم اپنے حدود و شرائط میں بہت ضروری بھی ہے اور معتبر بھی۔

علم کی ایک اور سطح ہے جسے حکمت یا معرفت کہتے ہیں۔ اس علم کا محور شے کی فعلیت سے زیادہ اس کی حقیقت ہے۔ یہ علم ٹکڑوں میں منقسم نہیں ہے بلکہ اس علم کا مقصد حقیقتِ کُلی کا ادراک اور اس کے حوالے سے مختلف اشیاء کی حقیقت کو سمجھنا اور ہر شے کا حقیقتِ کُلی سے ربط دریافت کرنا ہے۔ یہ علم جزوی نہیں کُلی ہوتا ہے۔ اس علم کا ایک مرکز ہے جس کے گرد معلومات کے دائرہ پھیلتے چلے جاتے ہیں مگر تمام دائرے مرکز سے مربوط ہوتے ہیں۔ اس علم میں ہر شے اپنی جگہ ایک وحدت بھی ہے اور اپنے سے ماورا کسی شے کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔ اور تمام اشیاء اس حقیقت کی طرف اشارا کرتی ہیں جو حقیقتِ کُلی اور حقیقتِ واحدہ ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو ہر شے میں جلوہ گر مگر ہر شے سے ماورا ہے اور جب انسان اس سطح سے فطرت کا مطالعہ

کرتا ہے تو وہ فطرت کو فطرت ہی کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ وہ فطرت کی سطح سے بلند ہو کر فطرت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ جب انسان فطرت کے حصار سے بلند ہو جاتا ہے تو پھر عالمِ نفس اور عالمِ فطرت میں ربط اور آہنگ ظاہر ہونے لگتا ہے۔

جب تک انسان کی نگاہ فطرت کے حصار کو توڑ نہیں سکتی اس وقت تک خود اس کے اس حصار میں محبوس رہنے کا اندیشہ قوی ہوتا ہے۔ فطرت اور انسان کے مابین ایک ایسی مغائرت رہتی ہے جس کا لازمی نتیجہ فطرت اور انسان کی باہمی کشمکش اور تصادم ہے۔ اس کے برعکس جب انسان فطرت کو خالق فطرت کے حوالے سے دیکھتا ہے تو پھر اس پر یہ خوش گوار حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ انسان اور فطرت کا خالق ایک ہی خدا ہے۔ اس لحاظ سے انسان اور فطرت میں تقابل یا تصادم نہیں ہے بلکہ ربط اور ہم آہنگی ہے اور انسان اور فطرت دونوں ایک ہی حقیقت کے پرتو ہیں اس لئے یہ دونوں بھی ایک دوسرے کا عین ہیں اور ایک دوسرے کو منعکس کرتے ہیں۔ درحقیقت فطرت اور انسان ایک مثلث کے دو ایسے کنارے ہیں جو اپنے خالق کے حوالے سے باہم مربوط

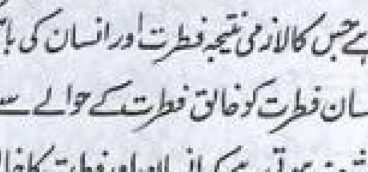

ہیں۔ اگر خدا کو درمیان سے نکال دیا جائے تو فطرت اور انسان میں مفاہمت کے بدلے مغائرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس مغائرت کا نتیجہ تقابل اور تصادم ہے۔ پھر علمِ فطرت اخلاقی قدروں سے تہی ایک ایسا علم بن جاتا ہے جس کا مقصد فطرت کی قوتوں کا حصول استحصال ہے اور اس قوت سے جہاں انسان کو بہت سے فائدے پہنچے ہیں وہاں انہیں پر ظلم و فساد کی صورتیں بھی ناگزیر طریقے سے پیدا ہو جاتی ہیں۔

جب انسان فطرت کو اللہ کے حوالے سے دیکھتا ہے تو پھر فطرت اللہ کی ربوبیت

کی نشانی بن جاتی ہے جس سے انسان بقاء حیات کے اسباب مہیا کرتا ہے۔ اس طرح انسان اور فطرت کے تعلق میں اخلاقی قدر پیدا ہو جاتی ہے اور انسان اس زمین کو تقدس اور حسن کا مظہر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا تمام روئے زمین کو میرے لئے مسجد بنایا گیا ہے۔ اس سطح علم پر فطرت کی تسخیر کا مقصد محض فطرت کی قوتوں کا استحصال نہیں رہتا بلکہ انسان فطرت کو اس لئے مسخر کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ فطرت کی حدود سے بلند ہو کر خالقِ فطرت کی حدِ معرفت تک رسائی حاصل کر سکے جس ریاض میں جان و جہان کی فلاح مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک طرف مختلف اشیاء کو اپنی آیات قرار دے کر اپنی معرفت کی دعوت دیتا ہے تو دوسری طرف انسان کو قلب و نظر عطا کرتا ہے جو تنے میں حقیقت کا جلوہ دیکھ سکے اور عقل ہو یا قوت ہو یا دولت ہو اس کی صحیح قدر کر سکے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚۖ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

(اور ان کے لئے مُردہ زمین میں ایک نشانی ہے کہ ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم اس میں سے اناج نکالتے ہیں جس میں سے وہ کھاتے ہیں اور اس میں ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ لگائے اور ہم ہی نے اس میں پانی کے چشمے جاری کئے تاکہ وہ ان کے پھل میں سے کھائیں اور یہ کام ان کے ہاتھوں نے نہیں کیا۔ کیا پھر بھی وہ شکر نہیں کریں گے)۔

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ اپنی جن نشانیوں کا ذکر کر رہا ہے ان میں سب سے پہلی نشانی مُردہ زمین کو زندہ کرنا ہے۔ اس زندگی کے نتیجہ میں زمین سے اناج اور پھل برآمد ہوتے ہیں جن سے انسان کا جسمانی تغذیہ ہوتا ہے، اور زمین سے پانی کے چشمے اُبلتے ہیں جن پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ مُردہ زمین کو زندہ کر کے

انسانی زندگی کی بقا کے اسباب مہیا کرتا ہے تاکہ انسان اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرے۔

خود زمین کی خلقت بھی اللہ کی نشانی ہے۔ اپنی خلقت کے بعد ایک طویل عرصے تک زمین پیداوار کی صلاحیت سے محروم رہی۔ مختلف اور طویل ارضیاتی ادوار سے گزرنے کے بعد زمین اس حالت میں آئی کہ اس میں اناج اور پھل اُگ سکیں اور پانی کے چشمے جاری ہو سکیں۔ زمین کی زرخیزی مُردہ زمین کا زندہ ہونا ہے جسے آقائے طباطبائی نے نفخِ حیات سے تعبیر کیا ہے۔ مُردہ زمین کو زندہ کرنا اللہ کی نشانی ہے۔ اسی طرح انسان کا حالتِ موت سے زندگی کی حالت میں تبدیل کیا جانا اور اس زندگی کے خاتمے کے بعد یوم بعث دوبارہ زندہ کیا جانا بھی اللہ کی نشانی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت ہے کہ وہ مُردہ زمین کو زندہ کر دے اسی طرح اس کی قدرت کی شان تخلیق انسان کو موت سے زندگی کی حالت میں تبدیل کر سکتی ہے۔ تخلیق اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ظہور کا پیرایہ ہے۔ وہ قدیر ہے اور اس کی قدرت کی شان یہ ہے کہ وہ خالق ہے۔

زمین سے اناج، پھل اور دیگر فصلوں کا اُگنا جو انسان کے لئے اسبابِ حیات فراہم کرتی ہیں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی شان ہے اور اسی طرح زمین شق ہو کر اس سے چشموں کا اُبلنا بھی اللہ کی نشانی ہے۔

آقائے طباطبائی نے فرمایا ہے کہ مُردہ زمین کو زندہ کرنا زمین میں نفخِ حیات ہے، زمین سے مختلف قسم کے دانوں اور پھلوں کا اُگنا اس کے قلب کا زندہ کرنا ہے اور زمین سے عیون یعنی پانی کے چشموں کا اُبلنا (عین کے معنی آنکھ کی مناسبت سے) گویا زمین کی آنکھوں کا کھولنا ہے اور ہمارے لئے اس تمام تدبیر امور کا مقصد اور منشا یہ ہے کہ انسان کی زندگی کے لئے اسباب فراہم کیا جا سکے۔ "لِیَاکُلُوْا" میں اسبابِ معیشت، سیری اور اطمینان شامل ہیں۔

وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ میں "ما" کے معنی نہیں بھی لئے گئے ہیں اور یہ معنی بھی لئے

گئے ہیں، جس کو لوگوں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے"۔ یہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کا انعام ہیں اس میں انسان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے لیکن اگر ما عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ کے یہ معنی لے جائیں کہ قدرتی نعمتوں پر عمل کر کے انسان اپنے بے شمار سامانِ زیست فراہم کرتا ہے، تو وہ بھی اللہ کی نعمت ہے اس لئے کہ انسان کو یہ استعدادِ عمل اور قوتِ تخلیق اللہ ہی نے عطا کی ہے۔ فعل اور عمل میں فرق یہ ہے کہ فعل عام ہے اور عمل خاص ہے جس میں مقصد و ارادہ و ترکیب بھی شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا تقاضا ہے کہ اس کا شکریہ ادا کیا جائے۔ کلام پاک میں شکر کا لفظ کفر کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ شکر احسان شناسی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شاندار تدبیر امور پر ایمان کی دلیل ہے۔ شکر کا مطلب ہے یہ کسی غرض اور حاجت سے ماوراء ہو کر دوسرے کی بڑائی اور اس کے احسان کا اعتراف کرنا۔ شکر وہ کیفیت ہے جس میں انسان کا کھلا ہوا دل ہوتا ہے اور نور اور نیکی سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔

مُردہ زمین کا زندہ کیا جانا اس بات کی نشانی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ مُردہ زمین کو زندہ کرنے پر قادر ہے اسی طرح وہ انسان کو مُردہ حالت سے زندہ حالت میں تبدیل کرسکتا ہے۔ اس نے زندگی کو موت سے برآمد کیا اور جب انسان پھر مردہ ہوجائے گا تو پھر اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔

زمین سے اناج، سبزیوں اور پھلوں کا برآمد ہونا اور نہروں اور چشموں کا جاری ہونا اس بات کی نشانی ہے کہ جس اللہ نے زندگی کو خلق کیا ہے وہی اس کے بقا کے لئے اسباب فراہم کرتا ہے۔ انسان کو عمل کی صلاحیت بھی اسی نے عطا کی ہے۔ وہی خالق ہے اور وہی رب ہے۔ وہی زندگی خلق کرتا ہے اور وہی زندگی کی بقاء کے لئے اسباب فراہم کرتا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ

اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾

(پاک ہے وہ ذات جس نے ہر شے کو جسے زمین اگاتی ہے اور خود ان کی (انسانوں کی) جنس کو اور ان چیزوں کو جسے وہ جانتے بھی نہیں سب کو جوڑے جوڑے پیدا کیا)۔

اس آیۂ مبارکہ میں اس حقیقت کو بیان کیا جارہا ہے کہ زندگی کی تخلیق اور اس کے اسباب کی طرح زندگی کے تسلسل کے اسباب بھی اللہ تعالیٰ ہی نے فراہم کئے ہیں اور انسان کو حصولِ علم کی صلاحیت اور توفیق اور تحصیل علم کے اسباب مُہیّا کرنے والا بھی وہی اللہ ہے

پاک ہے وہ اللہ جس نے سب کو زوج زوج خلق کیا۔ زمین سے اُگنے والی تمام چیزیں، انسان اور حیوان اور وہ تمام چیزیں جنھیں ہم نہیں جانتے سب کو جوڑوں میں پیدا کیا ہے۔ یہ ثنویت (DUALITY) مخلوق کی صفت ہے اور مخلوق کا جوڑے جوڑے ہونا ان کے خالق کی احدیت کی دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ احد ہے، صمد ہے، اس کا کوئی کفو نہیں ہے، اس کی ضد اور ندّ نہیں ہے۔ وہ ایسا ہست ہے جس کے مقابل نیستی نہیں ہے۔ وہ ایسا نور ہے جس کے مقابل ظلمت نہیں ہے۔ وہ ان تمام صفات سے پاک ہے جو مخلوقات میں پائی جاتی ہے۔ اس کی شان احدیت ہے اور مخلوق کی شان ثنویت۔

وہ احد ہے، اس نے تمام مخلوق کو زوج زوج خلق کیا ہے۔ سورۂ فجر کی وتر اور شفع کی جو قسم کھائی گئی ہے اس کے ایک معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ اس سے مُراد خالق اور مخلوق ہیں۔ سورۂ رحمٰن میں جسے قرآن کی زینت کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جتنی نعمتیں گنوائی ہیں ان سب کا ذکر جوڑوں میں کیا گیا ہے۔

مخلوقات کا زوج زوج خلق کیا جانا زندگی کے تسلسل کی ضمانت ہے اس کے ساتھ ہی تحصیل علم کا قرینہ ہے۔ علم حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اشیاء کا کوئی

مماثل ہو یا متقابل ہو۔

تقابل اور ضد کا سلسلہ صرف طبعی دُنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ اخلاقی دُنیا میں بھی یہ سلسلہ پایا جاتا ہے۔ نیکی اور بدی، خیر اور شر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ عالم اخلاق میں ان کا وجود ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہے اور انہی اضداد سے ایک دوسرے کی شناخت ہوتی ہے۔ اچھائی اچھائی اِس لئے ہے کہ وہ بُرائی کو چھوڑ کر اپنائی جاتی ہے۔ اِنسان فرشتوں کی طرح اچھا ہونے پر مجبور نہیں ہے بلکہ اس کے سامنے اچھائی اور بُرائی دونوں راستے کھُلے ہوئے ہیں۔ اسے اختیار ہے کہ وہ ان میں سے کسی ایک راستہ کو اختیار کرے انسان اپنے اختیار اور آزادی کو بروئے کار لاتے ہوئے بُرائی کا راستہ ترک کر کے نیکی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ خیر اور شر ایک دوسرے کی ضد بھی ہیں اور ایک دوسرے کی شناخت بھی کرتے ہیں۔ انہی کے ذریعے ایک دوسرے کو پہچانا جاتا ہے۔ ابو جہل، ابو جہل اس لئے بنا کہ وہ حضورؐ کے مقابل آ گیا اور یزید بطور یزید امام حسینؑ کی مخالفت سے پہچانا گیا۔ نیکی اور بدی کا یہ تضاد ہر سطح پر اور ہر دور میں جاری ہے۔ لیکن بُرائی کے چہرے سے نقاب اُلٹنے کے لئے یہ ضروری ہے نیکی کا ہاتھ اس کا پردہ فاش کر دے بلکہ خود نیکی کا وجود اور عمل بُرائی کی تشہیر کے لئے مؤثر ہے۔

مخلوقات کو زوج زوج خلق کرنا اللہ کی نشانی ہے۔ جتنی چیزیں زمین سے اُگتی ہیں انہیں جوڑوں میں پیدا گیا ہے نباتات میں بیشتر انواع میں نر اور مادہ کی تقسیم پائی جاتی ہے۔ دیگر انواع میں بھی تولید کا عمل متضاد خلیات کے ذریعہ جاری رہتا ہے اِنسان اور حیوان میں نر اور مادہ کی تفریق ایک معروف حقیقت ہے اسی طرح جمادات جنہیں بے جان سمجھا جاتا ہے، مثبت اور منفی ذرات کے تضاد سے خالی نہیں ہیں یہاں تک کہ یہ سلسلہ مادہ کی کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی یعنی ایٹم تک میں پایا جاتا ہے اگر ایٹم (ATOM) کے مثبت اور منفی برقیوں کے توازن میں خلل پیدا کر دیا جائے تو اس سے ایک دھماکہ جیسا

قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

امام راغب اصفہانی نے لفظ زوج کے جو مختلف معانی بتائے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) زوج وہ تمام چیزیں ہیں جو ساتھ ساتھ استعمال ہوتی ہیں جیسے جوتے موزے

(۲) وہ تمام چیزیں جو ایک دوسرے کے مماثل یا متقابل ہیں زوج کہلاتی ہیں جیسے دن رات، سیاہ سفید، سرد گرم

(۳) زوج مرد اور عورت دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا زوج ہیں۔

(۴) زوج ساتھی اور شریک کے معنوں میں بھی آتا ہے، زوج کے معنی گروہ کے بھی ہیں۔

(۵) مرکب چیزیں جو مختلف اجزاء کی ترکیب سے بنی ہیں ان میں تضاد کا اصول موجود ہے۔ مادہ اور صورت، جوہر اور عرض بھی زوج ہی کے معنوں میں آتے ہیں۔

زندگی کے تمام مدارج میں زوج ہونے کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بعض مفسرین نے ازواج کے معنوں کو نر اور مادہ کی تفریق تک محدود کیا ہے لیکن زیر مطالعہ آیت میں اس کے زیادہ صحیح معنیٰ ہیں جوڑا۔ اس مفہوم کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اس کے بعد کی آیات میں رات، دن، چاند اور سورج کا ذکر آیا ہے اور یہ ایک دوسرے کے زوج ہیں۔ نر اور مادہ کی تفریق کے اعتبار سے نہیں بلکہ جوڑا ہونے کے اعتبار سے امام راغب اصفہانی کا کہنا ہے کہ جنت کے ذکر میں جو زوجنا بحور العین آیا ہے یہاں بھی زوج کے معنیٰ ہیں ساتھی، اللہ تعالیٰ ہر انسان کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت پاکیزہ ساتھی عطا کرے گا۔

وَآيَةٌ لَّهُمُ اللَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَإِذَا هُم مُّظْلِمُونَ (۳۷)

(اور اس کی نشانیوں میں سے ان کے لئے ایک نشانی رات ہے اس میں سے ہم دن کو کھینچ کر نکال لیتے ہیں تو اس وقت یہ لوگ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں)۔

زیرِ مطالعہ آیات میں پہلے زندگی کی تخلیق کا ذکر آیا، پھر اس کے قیام کا ذکر ہوا، پھر اس کے تسلسل کی بات آئی اور اب گفتگو ماحول (ECOLOGY) پر کی جارہی ہے۔ ابھی تک زمین کا ذکر تھا اب آسمان کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔ اب لیل و نہار اور شمس و قمر کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے۔ اب یہ بتایا جارہا ہے کہ رات اللہ کی نشانی ہے اور رات میں سے کھینچ کر دن کا برآمد کیا جانا بھی اس کی زبردست رحمت ہے۔

اس موقع پر اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا مناسب ہے کہ کلام پاک میں اکثر مقامات پر لیل و نہار، ظلمت و نور اور موت و حیات کا ذکر ساتھ ساتھ آیا ہے لیکن ہر جگہ رات کا ذکر پہلے ہے دن کا ذکر بعد میں ہے، ظلمت کا ذکر پہلے ہے نور کا ذکر بعد میں ہے اور اسی طرح موت کا ذکر پہلے آتا ہے اور حیات کا ذکر بعد میں آتا ہے۔ اس کی مصلحت یہ ہے کہ رات، ظلمت اور موت منفی اشیاء ہیں جبکہ دن، روشنی اور حیات مثبت اشیاء ہیں اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ منفی چیزوں سے مثبت چیزوں کو برآمد کرتا ہے وہ نیست کو ہست میں تبدیل کرتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ رات میں سے کھینچ کر دن کو باہر نکالتا ہے۔ رات آرام اور سکون کے لئے بنائی گئی ہے لیکن اگر یہ رات ہمیشہ قائم رہے تو انسان اور اس کی زندگی کی کیا حالت ہوگی۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اس رات کو اَبدی بنا دیتا تو پھر کس میں یہ طاقت تھی کہ جو انسان کو اس ظلمت سے چھٹکارا دلاسکتا ہے۔ یہ فقط اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ وہ رات میں سے دن کو برآمد کرسکتا ہے، دن جدوجہد اور سعی و عمل کا وقت ہے۔ اسے فضل الٰہی کی تلاش کے لئے بنایا گیا ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ دن کو اَبدی بنا دیتا تو کس میں یہ طاقت تھی کہ وہ اسے رات سے بدل دیتا۔ گردشِ لیل و نہار کا یہ اُصول اللہ تعالیٰ کی زبردست رحمت اور حکمت کی نشانی ہے اور جن کی سماعت اور بصارت زندہ

ہے وہ ان نشانیوں کو دیکھ کر اپنے رب کی رحمت کا شکر ادا کرتے ہیں۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۳۸)

(اور سورج اپنے محور پر گردش کر رہا ہے یہ عزیز اور علیم اللہ کا مقرر کردہ اندازہ ہے)۔

رات اور دن کے تذکرے کے بعد اب سورج اور چاند کا ذکر کیا جا رہا ہے سورج کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ اپنے مقررہ مدار پر چلتا رہتا ہے اور چاند کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ اس کے لئے کچھ منازل مقرر کی گئی ہیں۔ یہ ان منازل کو طے کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ کھجور کی پرانی اور سوکھی ہوئی شاخ کی مانند ہو جاتا ہے۔ سورج کی حرکت ہمیشہ سے انسان کے لئے ایک حسّی مشاہدہ رہا ہے اور کلام پاک میں حسّی مشاہدہ روحانی حقیقت کی علامت ہے۔

بعض حلقوں میں رجحان پایا جاتا ہے کہ سائنسی انکشافات کی تطبیق قرآن حکیم میں تلاش کر کے جب بھی سائنس دان کسی حقیقت کو دریافت کریں اس بات کا دعویٰ کیا جائے کہ اس بات کا ذکر قرآن میں پہلے سے موجود ہے۔ یہ انداز نظر علمی طور پر کوئی صحت مند رجحان نہیں ہے بلکہ یہ ایک مغالطہ ہے۔ سائنس کا علم اپنے حدود میں معتبر اور مستند ہے مگر یہ علم کی ایک صورت ہے اور اس کو علم قرآن کے لئے ایک معیار بنانا جہالت ہے۔

آقائے طباطبائی کا فرمانا ہے کہ سورج کی حرکت کا ذکر کر کے حسّی مشاہدہ اور مناظر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس بحث سے قطع نظر کہ اس آیت کا موضوع حسّی مشاہدہ ہے یا سائنسی حقیقت، ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ اس آیۂ مبارکہ میں اس آفاقی اور کائناتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورج، چاند اور دیگر اجرامِ فلکی کے لئے جو رات مقرر کیا ہے وہ اسی راستہ پر سفر کر رہے ہیں اور اس وقت تک سفر کرتے رہیں گے جو وقت ان کے لئے مقرر کیا گیا ہے' اور طبعی کائنات کا یہ

قانون اللہ کی قدرت اور حکمت کی نشانی ہے۔

مستقر اسم زمان بھی ہے اور اسم مکان بھی ہے۔ اسم زمان کے اعتبار سے اس کے معنی ہیں وقت کی وہ حد جو کسی شے کے لئے مقرر کی گئی ہے، اسم مکان کے اعتبار سے اس کے معنی ہیں جائے استقرار، ٹھہرنے اور قرار کرنے کی جگہ۔

مستقر کے علاوہ اور اس کے ساتھ قرآن میں ایک اور لفظ استعمال ہوا ہے اور وہ ہے مستودع جس کے معنی ہیں سپرد کرنے کی، ودیعت کرنے کی جگہ، جیسے رحم مادر یا قبر، جبکہ مستقر مکانی لحاظ سے دنیا اور زمانی حد کے اعتبار سے قیامت ہے۔

معتبر تفاسیر اہل بیتؑ میں مستقر کے معنی اجل یعنی وقت کی حد کے لئے گئے ہیں۔ نظام دنیوی کے قیام تک سورج چلتا رہے گا یہاں تک کہ اس کا وقت ختم ہو جائے، یہی وقت کی حد اس کا مستقر ہے جہاں تک اسے پہنچنا ہے۔

گویا سورج کے لئے ایک راستہ مقرر ہے جس پر اسے بغیر کسی انحراف کے چلنا ہے اور اس وقت تک چلنا ہے جب تک کہ وقت کی وہ حد نہیں آجاتی جو اس کے سفر کے لئے مقرر ہے۔ بالفاظ دیگر سورج کو اپنے مقررہ مدار پر بغیر کسی انحراف کے قیامت تک مسلسل چلتے رہنا ہے اس لئے کہ سورج کی اسی حرکت پر اس نظام شمسی کی زندگی کا انحصار ہے جب اس سفر کی حد آجائے گی اور سورج کی حرکت رک جائے گی تو یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا سورج کا اپنے مدار پر مسلسل اور متواتر حرکت کرنا اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا وہ قانون ہے جسے تقدیر عزیز علیم کہا گیا ہے۔

کلام پاک میں مختلف مواقع پر مضامین کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کے مختلف اسم استعمال کئے گئے ہیں العزیز اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو ظاہر کرنے والا اسم ہے۔ عزیز انتقام اس کی جباری اور جلال کی شان کو ظاہر کرتا ہے۔ العزیز الحکیم اس کی اس قدرت کی شان کو ظاہر کرتا ہے جو حکمت سے لبریز ہے۔ کلام پاک میں یہ ترکیب سب سے زیادہ

کثرت سے استعمال ہوئی ہے۔ اس سے کم مواقع پر العزیز الرحیم کہا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اس قدرت کا اظہار ہے جو رحمت کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ہدایت اللہ کی رحمت ہے اس لئے جہاں ہدایت کا ذکر ہے وہاں العزیز الرحیم کی ترکیب استعمال ہوئی ہے اور جہاں تخلیق کا ذکر آیا ہے وہاں العزیز کے ساتھ علم کی صفت کا اضافہ کر کے العزیز العلیم کہا گیا ہے۔

العزیز العلیم اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خلق اور علم ساتھ ساتھ ہیں۔ خلق کرنا اور مارنا اللہ کی قدرت کی شان ہے اور اس کے علم کی شان یہ ہے کہ اس کا علم ہر شے پر محیط ہے، وہی اوّل ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے، اس کا علم اس کی تخلیق میں سرایت کئے ہوئے ہے، اس لئے یہ تخلیق ایک قاعدے اور قانون کے ماتحت ہے۔ چونکہ خلق اور علم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں اس لئے عالم تکوین میں قاعدہ، آئین، نظم اور ضبط ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی کائنات میں اتفاق یا حادثہ نام کی کوئی چیز نہیں ہے وہ عزیز علیم ہے اس نے ہر شے کو اپنی قدرت سے خلق کیا اور اس کی تخلیق اس کے علم کی مظہر ہے اس لئے اس میں قاعدہ، آئین، تنظیم اور ترتیب پائی جاتی ہے۔

سورج کی تخلیق اللہ تعالیٰ کے عزیز ہونے کی شان ہے اور سورج کا اپنے مقرر کردہ مدار پر چلتے رہنا اس کے علیم ہونے کی دلیل ہے اور اس کے العزیز العلیم ہونے کی شان یہ ہے کہ اس نے سورج کو خلق کیا اور اس کی حرکت کے لئے ایک مدار مقرر کیا اور سورج نہ اپنی گردش کو روک سکتا ہے اور نہ اپنے مقرر کردہ مدار سے انحراف کر سکتا ہے، وہ وقت کی اس حد تک جو اس کے لئے مقرر کی گئی ہے، اپنے مقررہ مدار پر گردش کرنے پر مجبور ہے۔ یہ تقدیر عزیز علیم ہے۔ اسی تقدیر سے سورج کی اسی مقررہ اور متواتر گردش سے ماہ و سال کی تقسیم اور زمانے کی تقویم عبارت ہے اور زمانے کی اسی تقویم کو جس کا اندازہ اللہ نے مقرر کیا ہے۔ دین قیم کہا گیا ہے کیونکہ اسی پر کائنات کی زندگی اور بقا کا دارومدار ہے۔

کلام پاک میں دینِ قیم کی اصطلاح دو معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ حقیقت کی دُنیا میں دینِ قیم سے مُراد توحید اور قیامت پر عقیدے کے وہ دو بنیادی اُصول ہیں جو تمام ادیان کی مشترک اساس ہیں۔ طبیعاتی دُنیا میں دینِ قیم سے مُراد وقت کی وہ تقویم ہے جس کی بُنیاد پر وقت دن، مہینہ اور سال میں تقسیم ہوتا ہے۔ وقت کی یہ تقسیم شمس و قمر کی گردش پر منحصر ہے۔

اس اللہ نے جو العزیز العلیم ہے اپنی قدرت کا اظہار اپنی تخلیق میں کیا اور اس کے علم کی شان یہ ہے کہ اس نے جو کچھ خلق فرمایا اس میں علم سرایت کئے ہوئے ہے، ہر شے ایک قاعدے کی پابند ہے، ہر چیز کا ایک حساب مُقرر ہے، اس نے ہر شے کے لئے وقت کا ایک اندازہ مُقرر کیا ہے اور وقت کی اس حد یعنی اجل کا علم صرف اسی کے پاس ہے۔

تقدیر کے معنی ہیں اندازہ۔ اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرر کیا ہے، ہر شے کو بقدر اندازہ صلاحیتیں عطا کی ہیں، اس کے رُجحانات کی حدیں مقرر کر دی ہیں۔ اور ہر شے کے لئے وقت کی ایک حد مُقرر کی ہے۔ گویا تقدیر سے مُراد ہر شے کے لئے ایک اندازہ قائم کرنا اور اس اندازے کے مطابق اس کی صلاحیتوں، رُجحانات اور اس کے وقت کی حد مقرر کرنا ہے۔

اِنسان کی تقدیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک خاص تقویم پر خلق کیا اس تقویم کے اعتبار سے اسے مخصوص صلاحیتیں عطا کیں۔ اسے ایک خاص وقت اور ماحول میں خلق کیا اور اس کی زندگی کی ایک مدّت مُقرر کی پھر اسے اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار دیا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ انہیں ترقی دے یا انہیں ضائع کر دے اِنسان کا یہ اختیار بھی دائرۂ تقدیر میں ہے۔ فرد کی صلاحیت اور ماحول ہی اس کی تقدیر ہے۔

کائنات کی ہر شے کی قدر مُقرر کی گئی ہے۔ تقدیر کا دائرہ ہر شے پر محیط ہے، آسمان، زمین اور ان کے درمیان کی ہر شے، فرد کی زندگی اور قوموں کی زندگی سب

کے لئے ایک تقدیر مقرر ہے۔ کائنات میں شر کا وجود اور خیر اور شر کا تصادم بھی دائرۂ تقدیر میں آتا ہے، خیر اور شر کا تضاد اور تصادم انسان کا امتحان بھی ہے اور اس کی صلاحیتوں کی ترقی اور تکمیل کا ذریعہ بھی ہے۔

کائنات کی ہر شے طوعاً یا کرہاً اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہے۔ انسان اور کائنات کی دیگر مخلوقات میں فرق یہ ہے کہ وہ تمام چیزیں قانونِ جبر کے تابع ہیں۔ انسان پر اللہ تعالیٰ کا یہ کرم ہے کہ اسے محدود دائرہ میں اختیار اور آزادی دی گئی ہے۔ وہ ایک مقررہ نہج پر چلنے کے لئے مجبور نہیں ہے۔ وہ نہ مکمل مجبور ہے نہ مُطلق آزاد۔ انسان جبر اور اختیار کے مابین ہے اس لئے تقدیر کو کسی بندے کی مجبوری نہیں سمجھا جا سکتا اور یہی آزادی اس کو ذمّہ دار بناتی ہے۔

انسان کی تقدیر میں جبر کا رُخ یہ ہے کہ اس کی ساخت، اس کی صلاحیتیں، اس کی زندگی کی مدت مقرر ہے، اسے ایک مخصوص وقت اور ماحول میں پیدا کیا گیا ہے جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہے لیکن اس میں اختیار کا پہلو یہ ہے کہ انسان کو یہ آزادی دی گئی ہے کہ وہ اپنی ان صلاحیتوں اور استعداد کو جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں جس طرح چاہے استعمال کرے، انہیں ترقی دے۔ ان کی تربیت و تہذیب کرے۔ یا ان کی طرف سے غفلت برت کر انہیں ضائع کر دے۔ انسان کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اپنی جدوجہد سے اپنے ماحول کو حسین اور پاکیزہ بنائے یا اسے فتنہ و فساد سے پُر کر دے۔ انسان کی تقدیر میں جبر اور اختیار کے یہ دونوں پہلو ساتھ ساتھ ہیں۔ انسان کی تقدیر اس کی آزادی اور مسئولیت کو ختم نہیں کرتی بلکہ اس آزادی کی حدیں متعین کرتی ہے۔

اسی طرح قوموں کی تقدیر کا معاملہ ہے جب اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ کسی قوم کو تباہ کر دے تو اس کے لئے ایسے اسباب فراہم ہو جاتے ہیں کہ وہ قوم خود اپنی تباہی کی راہ ہموار کر لیتی ہے۔ ہم جس دور میں رہتے ہیں ایٹمی اور نیوکلیئر جنگ کا خطرہ انسانیت

کے لیے سنگین سے سنگین تر ہوتا جا رہا ہے۔ تمام لوگ اس خطرے کو محسوس کرتے ہیں مگر ہر قوم اس خطرہ سے تحفظ کے لیے زیادہ سے زیادہ ہولناک ہتھیار ایجاد کرتی جاتی ہے اور خوفناک اسلحہ کی یہ دوڑ انسانیت کی تباہی کے خطرہ میں مزید اضافہ کیے جا رہی ہے۔

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿۳۹﴾

(اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی ٹہنی جیسا ہو جاتا ہے)۔

چاند کی تقدیر یہ ہے کہ اس کے لیے منازل مقرر کر دی گئی ہیں۔ ان منازل کی تعداد ۲۸ ہے جس کے بعد وہ پھر کھجور کی سوکھی ہوئی شاخ کی مانند ہو جاتا ہے۔ اس تشبیہ میں خشکی، زردی، کجی اور باریک ہونے کی صفات کی طرف اشارہ ہے۔

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾

(نہ سورج کو یہ قدرت ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ ہی رات دن پر سبقت کر سکتی ہے اور نہ ہی رات دن پر سبقت کر سکتی ہے۔ اور ہر ستارہ اپنے اپنے آسمان (مدار) پر چکر لگا رہا ہے)۔

سورج کی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ سکے اور نہ رات کو یہ اختیار ہے کہ وہ دن کو ایسا ڈھک لے کہ اس پر غالب آ جائے کہ یہ کارخانۂ قدرت ایک آئین اور نظام کے تحت چل رہا ہے یہاں تدبیر امور مسلسل جاری ہے۔ ہر چیز کا خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی ایک مقام ہے۔ سورج بڑی چیز ہے اس کے مقابلے میں چاند چھوٹا ہے۔ مگر بڑی چیز کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ چھوٹی چیز کو پکڑ لے۔ اسی طرح اختلاف لیل و نہار

کا سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ ہر رات کے بعد دن ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ رات دن پر حاوی ہو جائے یا رات کے بعد دن نہ آئے پھر رات ہو جائے۔ تدبیر وہ نہیں جو ایک وقت میں ہو اور دوسرے وقت میں رک جائے بلکہ تدبیر دائم ہے۔ اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہو سکتا، نہ وہ رک سکتی ہے جبتک کہ وقت مقررہ پورا نہ ہو جائے۔

فلک مدار فضائی ہے اور سبح ہوا یا پانی میں تیزی سے گزرجانا۔ یہ باریا دائرہ کی حرکت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ تمام اجرام فلکی اپنے اپنے فضائی مدار پر متواتر حرکت میں ہیں جس طرح مچھلی پانی

تمام اجرام فلکی اپنے اپنے فضائی مدار پر متواتر حرکت میں ہیں جس طرح مچھلی پانی میں تیرتی ہے۔ نہ اس سیر فی المدار میں کوئی رکاوٹ یا تصادم ہے نہ کوئی تساہل و تاخیر ہے۔ یَسْبَحُوْنَ میں جمع کی جو صورت ہے وہ عقلا کے لئے خاص ہے، گویا تمام اجرام فلکی طوعاً (کرہاً نہیں) تقدیر الٰہی پر سر بسجود ہیں۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾
وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ
لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۴۴﴾

(اور ان کے لئے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ ہم نے ان کی ذریت کو بھری ہوئی کشتی میں اٹھایا اور ہم نے ان کے لئے اس ہی کی مانند اور چیزیں خلق کیں جن پر سوار ہوتے ہیں اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں پس ان کا کوئی فریادرس نہ ہوگا اور نہ ہی وہ لوگ چھٹکارا پا سکتے ہیں سوائے ہماری رحمت کے اور ایک معین مدت تک ہماری طرف سے سامانِ زیست ہے)۔

تیسرے رکوع میں اب تک ہم نے جن آیات کا مطالعہ کیا ان میں پہلے زمین کا ذکر آیا۔ مردہ زمین کا زندہ کیا جانا اللہ کی قدرت کی نشانی ہے۔ پھر مخلوقات کی حیات کے بقا اور تسلسل کے لئے عام، آفاقی اور حیرت انگیز الٰہی تدبیر کا ذکر کیا۔ رات سے دن کا

برآمد کرنا بھی موت سے زندگی کو نکالنا ہے۔ اسی طرح انسان کی موت اور زندگی کا سلسلہ ہے اس کے بعد ہماری توجہ اجرامِ فلکی کی طرف منعطف کرائی گئی، سورج اور چاند کا اپنے اپنے مقررہ مدار پر گردش کرنا۔ وقت کی تقسیم وتقویم اللہ کی نشانی ہے۔ یہ تقدیرِ عزیزِ علیم ہے جس پر اس کائنات اور انسانی زندگی کی بقاء کا انحصار ہے۔ گویا زمین کے بعد آسمان کی بات آئی اور اب منظر پھر بدلتا ہے۔ اب فلک کے بعد فُلک کی بات شروع ہوتی ہے۔ فُلک کے معنی ہیں کشتی۔ یہ لفظ واحد اور جمع دونوں طریقے سے استعمال ہوتا ہے۔

اب تک جن آیات کا ذکر ہوا وہ طبعی کائنات سے متعلق تھیں اب جس آیت کا ذکر ہے اس میں انسان اور اس کے تہذیبی ارتقاء کا ذکر ہے۔ سمندر نقل وحمل کی راہ میں بظاہر ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو انسان کے لئے مسخر کر کے اس رکاوٹ کو دور کیا اور انسانی تہذیب کی ترقی لئے ایک زبردست محرک فراہم کیا۔ اسی طرح اس نے دوسری سواریاں بھی فراہم کی ہیں۔

اس آیت میں دو باتوں کا ذکر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے سمندر کو انسان کے لئے مسخر کیا اور اس کے لئے پانی پر سفر کرنے کے لئے کشتیوں کو فراہم کیا اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور قدرت کی زبردست نشانی ہے کہ کشتی پانی میں غرق نہیں ہوتی۔ اگر وہ چاہے کہ ان کشتیوں کو غرق کر دے تو پھر کسی کی یہ طاقت نہیں ہے کہ ان کو غرق ہونے سے بچا سکے۔

بے شک اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور میں یہ قدرت نہیں ہے کہ سمندر میں (یا فضائے آسمانی میں) راستوں کو انسان کے لئے مسخر کر سکے اور کشتیوں کو غرق ہونے سے بچا سکے۔ لیکن اس سے انسان کی سعی وعمل کی صلاحیتوں کی نفی نہیں ہوتی اس لئے کہ یہ صلاحیتیں بھی اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں اور اس کا امر یہ ہے کہ انسان اپنے عقل وشعور کو استعمال کرے۔ اپنی سعی وعمل کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر جدوجہد کرے۔ انسان کا کام سعی کرنا ہے۔

اس سعی کا نتیجہ بر آمد کرنا اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے منکر ہیں وہ انسان کی مطلق آزادی کے علمبردار ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہر بات کا اختیار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اس لئے انسان مطلق مجبور ہے۔ قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ حقیقت جبر و اختیار کے مابین ہے۔ کلام پاک کی آیات میں یہ سوال اٹھائے گئے ہیں کہ انسانی نسل کی افزائش، فصلوں کا اگنا، بارش کا برسنا، آگ کو پیدا کرنا اور اسی طرح کے دوسرے امور تم بجا لاتے ہو یا یہ تدبیر امور ہماری طرف سے ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تم پر موت طاری کر دے اور تمہیں ایسی حالت میں بدل دے جس کا تم شعور نہیں رکھتے۔ اگر تم خود کو اس قدر مختار سمجھتے ہو تو پھر موت کو ٹال دو۔ اپنے آپ کو مرنے سے بچا لو۔ تم اپنی پہلی خلقت پر غور کیوں نہیں کرتے۔ کیا اللہ کے علاوہ بھی اور کوئی الٰہ ہے کیا یہ شاندار تدبیر امور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی قدرتِ کاملہ، اس کی ربوبیت اور حکمت کی روشن دلیل نہیں ہے پھر تم کیوں عدل نہیں کرتے۔ انصاف سے کام کیوں نہیں لیتے۔

یہ تمام کارخانہ قدرت اللہ تعالیٰ کا خلق کیا ہوا ہے وہی خالق ہے، وہی باری ہے، وہی مصوّر ہے۔ وہ اشیاء کو خلق کرتا ہے، ان کا تسویہ کرتا ہے، ان کی قدر معلوم کرتا ہے اور انہیں جس مقصد کے لئے خلق کیا گیا ہے۔ ان کی تقدیر کے مطابق ہدایت کرتا ہے خلق، تسویہ، قدر اور ہدایت اسی کی طرف سے ہے۔ عزیز علیم کی مقرر کی ہوئی تقدیر ہر شے کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ وہ ہر شے کا اندازہ مقرر کرتا ہے۔ اس اندازے کے مطابق اس کے خواص بناتا ہے جس مقصد کے لئے بنایا ہے ان کے لحاظ سے خاص صلاحیتیں اور استعداد عطا کرتا ہے اور پھر اسی تقدیر کی طرف اس کی ہدایت فرماتا ہے۔

یہ دنیا بیشک عالم اسباب ہے لیکن سبب کو مؤثر بنانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ سبب اور نتیجہ میں بظاہر کوئی تعلق اور ربط نہیں ہے سوائے اس کے کہ سبب پہلے ہے اور نتیجہ بعد میں

یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی شان ہے کہ وہ سبب کو مؤثر کرکے اس سے نتیجہ برآمد کرتا ہے۔ انسان کو اس نے عقل و شعور کی دولت دی ہے اور سعی و عمل کی صلاحیت عطا کی ہے۔ انسان ایک محدود دائرہ میں مختار ہے۔ اس دائرہ کی حد ایک طرف اس کی بڑھتی ہوئی صلاحیتیں ہیں اور دوسری طرف تغیر پذیر زمانہ ہے۔ انسان کی آزادی اس میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق سعی و عمل کے بیج بوتا ہے۔ اس سعی کا نتیجہ برآمد کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تخلیق علم کے ساتھ ہے اس نے ہر شے کو علم کے ساتھ خلق کیا ہے اسلئے یہ کائنات ایک قاعدے اور قانون کی پابند ہے۔ اس کا علم ہر شے پر محیط اور ہر شے میں سرایت کئے ہوئے ہے، ہر شے اس کے امر کے تابع ہے انسان اسی کا اذن ہے اور اسی کے بخشے ہوئے علم سے فطرت کی تسخیر کرتا ہے۔ خواہ انسان اس بات کا شعور رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ انسان کو جو کچھ علم ملا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہے۔ اسی نے ہمیں عقل و شعور کی دولت عطا کی۔ اسی نے ہمیں علم حاصل کرنے کی صلاحیت بخشی اسی نے علم حاصل کرنے کے راستے بتائے۔ جو کوئی ان راستوں پر جد و جہد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنے علم کی جس قدر جھلک مناسب سمجھتا ہے عطا کر دیتا ہے۔ انسان کی ہر دریافت اور ہر ایجاد الہام ہے جو اسے ہوتا ہے جس نے محنت اور لگن سے اللہ کی نظروں میں اپنے آپ کو الہام کے قابل بنایا ہو۔ مجوبانہ ہو یا عارفانہ انسان کا علم عطیۂ قدرت ہے اور انسان کو جو کچھ اور جس قدر علم عطا ہوا ہے وہ اس کی ضرورت اور ظرف کے مطابق اور اس کی سعی و کوشش کے متناسب ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ کائنات عالم اسباب ہے اور مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی سبب سے نتیجہ کا برآمد کرنے والا ہے، اس کی تقدیر ہر شے پر غالب ہے۔ تقدیر کا انکار اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار ہے۔ وہ علیٰ کُلِّ شَیٍٔ قدیر ہے۔ لیکن انسان کو اس نے

عقل و شعور، ارادہ اور اختیار دیا ہے، اسے محدود معنوں میں آزادی دی ہے اور اسے مسئول بنالیا ہے۔ یہی انسان کی تقدیر ہے۔ انسان کی مسئولیت کا انکار انسان کے شرف و عزت کا انکار ہے۔ بالفاظِ دیگر اگر تقدیر کا انکار اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا انکار ہے تو انسان کی مسئولیت اور آزادی کا انکار اس کی انسانیت کا انکار ہے۔

اس تمام کارخانۂ قدرت کا نظام اللہ تعالیٰ کی مُقرر کردہ تقدیر کے تابع ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت ہے کہ یہ نظامِ تکوین قائم ہے ورنہ اس کی بُنیاد بہت نازک توازن پر ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کشتی کا پانی پر چلنا۔ کشتی جو پانی پر چل رہی ہے اس کا غرق ہونا زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے، زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کشتی پانی پر چل رہی ہے اور غرق نہیں ہوتی! اور اس توازن میں فرق پڑجائے جو اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کے قانون قائم رکھے ہوئے ہیں تو جس آسانی کے ساتھ یہ کشتی پانی میں ڈوب سکتی ہے اسی آسانی سے یہ تمام نظامِ عالم دَرہم و برہم ہوسکتا ہے۔ تمام عالمِ تکوین کی بساط لپٹ سکتی ہے۔ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ یہ نظامِ کائنات جاری و ساری ہے۔ بیشک اس کی رحمت پر بھروسہ بہت بڑا بھروسہ ہے مگر اس نظام کی بُنیاد بہت نازک ہے اور اللہ تعالیٰ جب چاہے یہ سب کھیل اسی طرح ختم ہوسکتا ہے جیسے کہ کوئی کشتی پانی میں ڈوب جائے۔

شیخ کبیر جناب محی الدین ابن عربی کا فرمانا ہے کہ اس آیۂ مُبارکہ میں جس کشتی کا ذکر ہے وہ کشتیِ نوح ہے جس کے ذریعہ ذُرّیتِ آدمؑ کو اس طوفان میں تحفظ عطا کیا گیا جس کی زد سے کوئی شے محفوظ نہ تھی اور من مثلہ سے مُراد وہ سفینۂ نجات ہے جس کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ میرے اہلِ بیت کی مثال کشتیِ نوحؑ کی سی ہے، جو اس میں سوار ہوجائے گا نجات پائے گا اور جو اس سے کنارہ کشی کرے گا غرق ہوجائے گا۔

نجوم و کواکب کے سیر فی الفلک میں اور ذرّیت (یعنی چھوٹی اولاد لیکن یہ بڑے چھوٹے سب کے لئے استعمال ہوتا ہے)، بنی آدم کے کشتی میں سفر میں مماثلت ہے۔ مُشکل میں،

حرکت میں، تسخیر میں، امرِالٰہی میں، حفظ و قدرت میں، کشتی میں سفر ایک مثال ہے۔ ان تمام طریقوں کی جن کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی آسان اور مفید حرکت کے لیے تسخیر کیا ہے۔ ماضی میں جانوروں کا تابع کرنا، حال و مستقبل میں طیارے یا ہوا کی کشتیاں اور جو کوئی اور طریقے ایجاد ہوں۔

حافظ اور حامل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اور ابتلا کی کیفیت میں فریاد کو سننے والا یا غرق ہونے سے بچانے والا اس کے سوائے کوئی نہیں، اس کی رحمت بڑی اور چھوٹی ہر شے اور حرکت پر جاری و ساری ہے اور ایک معین وقت تک کے لئے اس کی مخلوق کے حیات و بقا کے لئے اس نظام میں مفید ساز و سامان مہیا کر دیا گیا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ڈرو اس سے جو تمہارے سامنے ہے اور جو پیچھے ہے تاکہ تم پر رحم کیا جائے (تو وہ توجہ نہیں دیتے)۔

اب تک جن آیات کا مطالعہ کیا گیا ان میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں کا ذکر کیا جن کا تعلق اس کائنات کی تخلیق، تنظیم، تدبیر اور تقدیر ہے۔ یہ صحیفۂ کائنات خود ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جس کی ہر آیت اللہ کی وحدت اور قدرت پر دلیل ہے۔ پھر ان آیات کا ذکر کیا گیا جن کا تعلق انسان کی تخلیق اور تقدیر ہے۔ انسان کی زندگی اسکی بقا اس کا ارتقا صرف اور صرف اللہ کی رحمت پر منحصر ہے۔ اب یہ ذکر ہو رہا ہے کہ ان تین نشانیوں کی طرف انسان کا رویّہ کیا ہے۔ ان سب آیات کا تقاضا یہ ہے کہ ان پر تفکر اور تعقل کیا جائے تاکہ انسان حقیقت کو دریافت کر سکے۔ اپنے مقصدِ حیات کو سمجھ سکے اور اپنی زندگی کے لئے صحیح راستہ اختیار کر سکے۔ مگر انسانوں کی حالت یہ ہے کہ ان واضح آیات کے ہوتے ہوئے نہ ان کے قلوب زندہ ہوتے ہیں نہ ان کی سماعت اور بصارت

بیدار ہوتی ہے اور نہ وہ ان آیات سے کوئی عبرت یا نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی آیات نہایت واضح اور روشن ہیں۔ لیکن یہ نشانیاں جس قدر بیّن اور بدیہی ہیں اسی قدر انسان ان کو معمولی سمجھ کر ان کی طرف سے غفلت برتتا ہے زندگی اور موت کا نظام، زمین سے فصلوں کے اُگنے کا نظام، سورج، چاند اور دیگر اجرام فلکی کا نظام یہ سب وہ حقیقتیں ہیں جن سے زیادہ مشاہدے میں آنے والی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی لیکن انسان انہی باتوں سے سب سے زیادہ غافل ہے۔ وہ ان نشانیوں کی طرف توجہ نہیں کرتا اس کا قلب غافل ہے، اس کی سماعت اور بصارت پر پردہ ہے۔ اگر انسان ان آیاتِ الٰہی پر غور وفکر کرے تو اس کے دل میں حقیقت کی تلاش اور اپنی زندگی کے لئے صحیح راستہ کی دریافت کی تڑپ کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

زیرِ مطالعہ آیت میں انسان کو اسی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے کہ وہ آخر اس بات پر کیوں غور نہیں کرتا کہ اس کی زندگی اور اس کا ماحول اس سے کس بات کا متقاضی ہے، اس کے لئے اس دُنیا میں زندہ رہنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ یہ دُنیا جہاں ہر لحظہ موت سے زندگی پیدا ہو رہی ہے، جہاں انسان جو کچھ نہیں تھا اب کچھ بنا دیا گیا ہے۔ جہاں فطرت کی تمام طاقتیں اس کی پرورش اور تربیت کے لئے مصروف کار ہیں جہاں اس کے علم حاصل کرنے کے لئے اشیاء کو مقابل یا مماثل بنایا گیا ہے، جہاں رات اور دن کا اختلاف اور تسلسل قائم ہے، نہ ہمیشہ رات رہتی ہے اور نہ دن، جہاں تمام اجرام فلکی اپنے اپنے مقررہ مدار پر چل کر تقدیرِ عزیز علیم کی تصدیق کر رہے ہیں، جہاں انسان کے لئے پانی اور ہوا کو مسخر کر دیا گیا ہے تو یہ دُنیا انسان سے کس قسم کی زندگی کا تقاضا کرتی ہے۔ اس دُنیا کی حقیقت کیا ہے؟ انسان کی اپنی حقیقت کیا ہے اور اس دُنیا میں انسان کو اپنی زندگی کس طرح گزارنی چاہیئے آخر ان سوالوں پر غور کیوں نہیں کرتا۔ آخر آیاتِ الٰہی سے عبرت اور نصیحت حاصل کیوں نہیں کرتا۔

شیخ سعدیؒ نے اس بات کو زبانِ شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

ابر و باد و مہ و خورشید ہمہ در کار ند ۔۔۔ تا کہ نانے تو بکف آری و بہ غفلت نہ خوری

ایں ہمہ بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار ۔۔۔ شرطِ انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری

اللہ تعالیٰ کے کرم کی شان یہ ہے کہ وہ انسان کو اِن آیتوں پر غور کر کے تقویٰ حاصل کرنے کی دعوت دے رہا ہے تاکہ اس پر رحم کیا جا سکے۔ گویا انسان کو جو یہ دعوتِ تفکّر دی جا رہی ہے اسی پر اس بات کا انحصار ہے کہ یہ دُنیا عدل و احسان کی جنت بنتی ہے یا ظلم و جہل و فساد کا جہنم۔

اللہ تعالیٰ کی صرف یہی رحمت نہیں ہے کہ اس نے انسان کو سمع، بصر، افئدہ سے نوازا، اس کو تفکّر اور تعقّل کا اہل بنایا اور صرف اس کی یہی رحمت نہیں ہے کہ اس نے صحیفۂ کائنات میں ہر چھوٹی بڑی چیز میں، کُل میں اور جزو میں بھی نشانیاں رکھیں بلکہ رحمت بالائے رحمت ہے کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے ہادی بھیجے تاکہ وہ لوگوں کے قلوب کو زندہ کریں۔ ان کی سماعت اور بصارت کی تربیت کر کے انہیں ماضی اور مستقبل کی طرف متوجّہ کریں۔ ان کو کائنات میں اللہ کی وحدت، ربوبیت، حکمت اور رحمت کی نشانیاں دکھا کر، اس کی تدبیر کی لطافت اور تقدیر کے استحکام کی دلائل دکھا کر ان کو غفلت کی حالت سے نکالیں تاکہ وہ آیاتِ الٰہی پر تفکّر کر کے تقویٰ حاصل کر سکیں لیکن انسان کی غفلت کا یہ حال ہے کہ وہ صحیفۂ کائنات کی آیات سے کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتا اور جب اللہ کے بھیجے ہوئے ہادی اسے ان آیتوں کی طرف متوجّہ کرتے ہیں تو وہ نہ صرف ان کا انکار کرتا ہے بلکہ ان کا استہزا بھی کرتا ہے۔ وہ ان کے انذار کا مذاق اڑاتا ہے۔ نہ صرف اللہ کی رحمت سے غفلت برتتا ہے بلکہ عذابِ الٰہی سے بھی بے پرواہ رہتا ہے۔ وہ ان رسولوں کا جو اسے آیاتِ الٰہی کی طرف متوجّہ کرتے ہیں اور اسے راستے کے خطرات سے متنبہ کرتے ہیں انکار کرتا ہے، نہ اس میں شعور و حس بیدار ہوتی ہے نہ تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور وہ اسی عذاب کی طرف عجلت کرتے ہیں جس سے پیمبروں نے انہیں ڈرایا تھا۔

وَ قِیْلَ فعل مجہول ہے یہ خطاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے خواہ نفس کو الہام

کرے، خواہ یہ کہ اللہ اپنے رسول کے ذریعے ہدایت کر رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان تقویٰ حاصل کر کے خود کو رحمتِ الٰہی کا سزاوار بنا سکے۔

تقویٰ کے معنی ہیں شعور اور قلب کی بیداری اور تباہی سے بچ کر نجات کے راستے کی تلاش اور راستے میں جو رکاوٹیں اور کانٹے ہوں دامن کو اس طرح سمیٹ کر چلنا کہ دامن کانٹوں سے محفوظ رہے۔ گویا تقویٰ کے معنیٰ ہوئے راستے کی طلب، راستہ پر چلنا اور اس راستے کے خطرات سے خود کو محفوظ رکھنا۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان کا قلب بیدار ہو۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں اور اس کے کانوں پر مہریں نہ لگی ہوں۔ تقویٰ اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان خود اپنا رقیب یا نگہبان ہو۔ وہ خود سے الگ ہو کر اپنے نفس کا مراقبہ کرے اور ساتھ ہی اپنے گرد و پیش پر نگاہ رکھے۔ بالفاظِ دیگر تقویٰ کا مطلب ہے شعور کی وہ بیداری جس کے نتیجے میں انسان خود اپنا اور اپنے ماحول اور حالات کا مسلسل احتساب کرتا رہتا ہے۔ تقویٰ کے مفہوم میں دو باتیں شامل ہیں۔ حقیقت کی طلب اور اس حقیقت تک پہنچنے والے راستے کی تلاش اور اس راستے پر چلنا۔ اس سورۂ مبارکہ کے پہلے رکوع میں انہی دو باتوں کو اتباعِ ذکر اور خشی الرحمٰن بالغیب کے لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ جب انسان دُنیا کی حقیقت پر غور کرتا ہے اور اس حقیقت تک پہنچنے والے راستے کی تلاش اس کے دل میں ایک تڑپ پیدا کر دیتی ہے تو پھر اللہ بندے پر ہدایت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ تقوے اور ہدایت ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہیں۔ سورۂ بقرۃ کی ابتدا میں یہی بات کہی گئی ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ یہ کتاب ہدایت ہے صاحبانِ تقویٰ کے لئے اور یہ ایسی ہدایت ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ وہ علم نہیں ہے جس میں ظن و تخمین کا کوئی رُخ نکل سکے بلکہ یہ علم فطرت انسانی کی تصویر ہے جس پر اللہ نے اسے پیدا کیا ہے یہ ہدایت ہے ان متقین کے لئے جو حقیقت

اور صراط کی طلب یہ کہتے ہیں۔

مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡکُمۡ وَمَا خَلۡفَکُمۡ کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ اس سے مُراد ہے وہ شرک اور معصیت جس میں انسان زمانۂ حال میں گرفتار ہے اور وہ گناہ جو وہ ماضی میں کرچکا ہے' اس کی ایک اور توجیہ یہ ہے کہ اس سے مُراد دُنیا اور عاقبت ہے یعنی انسان دُنیاوی زندگی میں عاقبت پر نگاہ رکھے اور اپنی بَداعمالیوں کے نتائج سے ڈرتا رہے۔ بہر عنوان اس سے مُراد آگے پیچھے دیکھنا ماضی اور مستقبل پر نگاہ رکھنا ہے۔ ماضی سے نصیحت حاصل کر کے مستقبل کو سنوارنا ہے اور یہ بھی انسان کی امتیازی صفت ہے جو دوسرے جانداروں میں نہیں پائی جاتی۔ جانوروں کا وقت صرف حال ہے۔ وہ ماضی کو نہیں دیکھ سکتے اور نہ مستقبل کی فکر کر سکتے ہیں جبکہ انسان کو یہ صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ ماضی اور مستقبل پر نگاہ رکھ سکتا ہے۔ ایک دُوسرے رُخ سے اس بات کو یُوں کہہ سکتے ہیں کہ جو ماضی سے سبق حاصل نہیں کرتا جو مستقبل کو سنوارنے کی جدوجہد نہیں کرتا بلکہ جو صرف اپنے حال میں مُست ہے وہ گویا انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانیت کی سطح پر اُتر جاتا ہے۔ وہ اپنی انسانیت کی نفی کر دیتا ہے! اور تقویٰ فطرتِ انسانی کا تقاضا بھی ہے اور شرف بھی۔

انسان کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ وہ ماضی سے درسِ عبرت حاصل کرے۔ خود اپنے نفس کا مشاہدہ اور محاسبہ کر کے اسے بُرائیوں سے پاک کرتا رہے۔ سابقہ قوموں کی تاریخ کو دیکھ کر قوموں کے عروج و زوال کے حقیقی اسباب و محرکات کا شعور حاصل کرے۔ اسی شعور اور آگاہی کے نتیجے میں جو اپنے نفس، تاریخ اور کائنات کے مطالعے سے حاصل ہوتا ہے فرد اور قومیں اپنے لئے صحیح راہِ عمل منتخب کر سکتی ہیں۔ راستہ کے خطرات سے آگاہ ہو کر ان سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ صحیح سلامت منزلِ مقصود پر پہنچ سکتا ہے۔ یہی تقویٰ کی وہ کیفیت ہے جس کا حکم دیا جا رہا ہے اور تقویٰ کو اختیار کرنے کا حکم اس لئے دیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم فرما سکے۔ یعنی بندے خود

کو اپنے رب کے رحم کا سزاوار بنا سکیں۔

لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔ انسان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت بے حساب ہے، انسان کا وجود اس کی تربیت، پرورش اور بقاء اللہ کی رحمت ہے۔ اس سے پہلے کی آیت میں ہم مطالعہ کر چکے ہیں کہ سمندر میں کشتیوں کا چلنا اور غرق نہ ہونا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، اسی طرح ہدایت اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ گویا طبعی سطح پر رحمت سے مُراد انسان کی تخلیق، تربیت، پرورش، بقا، سلامتی اور ترقّی کے اسباب ہیں اس کی ربوبیت ہے اور روحانی سطح پر رحمت سے مُراد ہدایت ہے جس سے زندگی کی معنویت اُجاگر ہوتی ہے اور زندگی کے لئے ایک راستہ اور ہدف معین ہوتا ہے۔ تقویٰ سے اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے، یعنی اللہ کی ربوبیت اور ہدایت سے بہرہ ور ہو کر دُنیا اور دین میں کامیاب ہوتا ہے۔

وَمَا تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿٤٦﴾

(اور ان کی حالت یہ ہے کہ جب ان کے رَب کی نشانیوں میں سے ان کے پاس آیت آتی ہے تو یہ اس سے رُوگردانی کئے بغیر نہیں رہتے)۔

رسول اور ہادی نے جوان سے کہا کہ تقویٰ کرو اور سنو اور دیکھو اور غور کرو اور ڈرو ان باتوں سے جو ماضی میں ہو چکی ہیں اور جو مستقبل میں ہونے والی ہیں تو جو کچھ انھوں نے جواب دیا وہ اس قابل نہیں ہے کہ اسے لکھا جائے اس کو حذف کیا گیا اس کا اندازہ بس اس متاسفانہ تبصرے سے لگا لو۔ وہ دُنیاداری میں اس قدر ملوث ہیں کہ نہ بشارت کی آیت سے دل میں طلب بیداری ہوتی ہے نہ عذاب کی آیات سے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے، ہر آیت کی طرف سے مُنہ موڑ لیتے ہیں، نہیں معلوم نہیں کہ ان آیتوں سے غفلت کے نتیجے میں وہ آیت آنے والی ہے جس سے

نہ چشم پوشی ممکن ہے، نہ گریز ممکن ہے، نہ نجات۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٤٧﴾

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خرچ کرو اس میں سے جو تم کو اللہ نے دیا ہے تو وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کیا ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم اسے کھلائیں جسے اگر خدا چاہتا تو خود کھلا دیتا۔ تم لوگ تو بیشک واضح گمراہی میں پڑے ہوئے ہو)۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس رزق میں سے خرچ کرو کہ جو تمہیں اللہ نے دیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم ان کو کھلائیں جنہیں اللہ اگر چاہتا تو خود کھلا سکتا تھا۔ کہا گیا ہے کہ یہ بات مومنوں نے کافروں سے کہی، سیاق یہ بات بتا رہا ہے کہ یہ بات بھی خدائی ہدایت کا ایک حصہ ہے۔

زیر مطالعہ آیت میں گفتگو انسانوں کے باہمی معاملات کی طرف آ گئی۔ دین کے دو بڑے شعبے ہیں۔ عبادات اور معاملات، عبادات بندے اور اللہ کا تعلق اور معاملات بندوں کے باہمی تعلقات سے عبارت ہیں۔ بالفاظِ دیگر دین کا ایک حصہ تعظیم لامر اللہ ہے اور دوسرا شفقت الی خلق اللہ لوگوں نے تعظیم لامر اللہ کی دعوت کا کیا جواب دیا اس کو قرآن میں نقل نہیں کیا گیا البتہ شفقت الی خلق اللہ کی دعوت کا جو جواب دیا گیا ہے اسے قرآن نے نقل کیا ہے اور اس جواب کی روشنی میں دو متضاد اور متصادم نظریہ ہائے حیات ہمارے سامنے آتے ہیں۔

دین کی تعلیمات کے مطابق زندگی کو ناپنے کا پیمانہ اقدار (QUALITY) کا پیمانہ ہے۔

دین کا انکار کرنے والوں کے نزدیک زندگی کا پیمانہ مقدار (QUANTITY) کا پیمانہ ہے۔

دین مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُونَ کی تعلیم دیتا ہے۔ اس میں علم، دولت، اقتدار

سبھی کچھ شامل ہے۔ مومن کا رویہ انفاق کا رویّہ ہے۔ یہ عدل واحسان کا راستہ ہے جو باقی رہنے والا ہے۔ انفاق کے اصول کا اطلاق فرد پر بھی ہوتا ہے اور قوم پر بھی۔

اس کے برعکس دین کا انکار کرنے والوں کا رویّہ زیادہ سے زیادہ دولت اور طاقت اکٹھا کرنے کا رویّہ ہے۔ یہ انفاق کے برعکس اکتناز کا رویہ ہے۔ اکتناز کا راستہ استحصال کا راستہ ہے۔ ایک فرد دوسرے فرد کا استحصال کرتا ہے اور ایک قوم دوسری قوموں کا استحصال کرتی ہے۔ یہ راستہ بظاہر مضبوط نظر آتا ہے مگر حقیقتاً بہت ناپائیدار ہے۔ بہت سی قومیں اپنی دولت اور طاقت کی کثرت کے باوجود ہلاک ہوگئیں اس لیے کہ انہوں نے عدل واحسان کا راستہ چھوڑ دیا تھا۔ وہ یتیم کا اکرام کرنے اور مسکین کو کھانا کھلانے کے فریضے سے غافل ہوگئے تھے۔

کافر یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس جو دولت اور طاقت ہے وہ اس نے اپنی سعی سے حاصل کی ہے۔ قارون کا دعویٰ یہی تھا کہ میں نے تمام دولت اپنے علم کے ذریعہ حاصل کی ہے اس لئے اس میں دوسروں کا کوئی حق نہیں ہے ہر دَور میں اہلِ دولت و اقتدار کا یہی رَویّہ ہوتا ہے۔ ہمارے دَور میں سُپر پاورز کا اندازِ نظر بھی یہی ہے۔

اس کے برعکس مومن یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال و دولت ہے یہ اس کے رَب کی عطا کی ہوئی نعمت ہے اور اگر اسے رزق میں دوسروں پر تفوق حاصل ہے تو یہ بات بجائے خود اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کرے۔ اور انہیں اپنے برابر لانے کی کوشش کرے۔ معیشت میں تفاوت بھی باللہ تعالیٰ کی نشانی ہے لیکن اس قدر کہ انسان انسان نہ رہے۔ ایک طرف تکبّر کی وجہ سے دوسری طرف عجز کی وجہ سے۔ یہ اللہ کے عذاب کا پیش خیمہ ہے جس طرح تمام انسانوں کی صلاحیتیں ایک دوسرے سے مختلف ہونے سے انسانی مساوات پر ضرب نہیں پڑتی اسی طرح انسانوں کے درمیان معیشت کے تفاوت سے انسانی مساوات کی تردید نہیں ہونی چاہیے بلکہ یہ فرق اور تفاوت محض اس

حد تک ہو کہ اس سے سماجی زندگی کا کاروبار چل سکے۔ ورنہ انسانیت کے حوالے سے تمام انسان آپس میں مساوی ہیں۔ اگر کسی شخص کو دوسرے شخص پر کسی اعتبار سے کوئی تفوق حاصل ہے تو اس تفوق اور برتری کو دوسروں کا استحصال کرنے کا ذریعہ بنانا ظلم ہے۔ انسانیت کے رشتے سے تمام انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور رشتۂ اخوت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کی نہ صرف مدد کرے بلکہ اسے اپنے برابر لانے کی کوشش کرے نہ یہ کہ اس کا استحصال کر کے اس کو غلام بنائے۔

اکتناز کا رویہ دوسروں کا استحصال کر کے انہیں اپنا غلام بنانے کا رویہ ہے جبکہ انفاق کا رویہ دوسروں کی مدد کر کے انہیں اپنے برابر لانے کا رویہ ہے۔ استحصالی نظام میں اگر ایک شخص دوسرے کی مدد کرتا ہے تو اس میں بھی اس کا مفاد اور مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے اس لئے کہ کوئی معاشرہ انتہائی دولت اور انتہائی غربت کے تضاد کو سہار نہیں سکتا۔ گویا استحصالی نظام میں دوسروں کی مدد کا تصور بھی افادیت (UTILITY) پر منحصر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس صاحبانِ ایمان انفاق کرتے ہیں وہ تمام مخلوق کو اللہ کا کنبہ سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کو اپنا انسانی اور ایمانی فریضہ تصور کرتے ہیں۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٨﴾ مَا يَنظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ ﴿٤٩﴾

(اور وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو آخر وہ وعدہ (وعدہ عذاب) کب پورا ہو گا۔ یہ لوگ تو صرف ایک چنگھاڑ کا انتظار کر رہے ہیں جو ان کو اس وقت آئے گی جب وہ آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے)۔

پہلی آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ لوگوں نے دعوتِ رسالت کا انکار کیا، عبادات اور معاملات کا انکار کر کے تباہی کے راستہ کو اختیار کیا اور اب وہ اس بات کو استہزائیہ طور پر کہہ رہے ہیں کہ تم جس عذاب سے ڈراتے ہو وہ کب آئے گا، اس کے بعد کی آیت میں یہ بتایا

جا رہا ہے کہ یہ لوگ جنھوں نے دعوتِ رسالتؐ کا انکار کر کے خود پر عذابِ الٰہی کو مستحق کر لیا ہے نہیں انتظار کر رہے مگر ایک چنگھاڑ کا جو انہیں ایسی حالت میں آ پکڑے گی کہ وہ باہم جھگڑ رہے ہوں گے۔ دُنیاوی جھگڑوں میں مُلوّث ہوں گے اور آخرت کا مذاق اُڑا رہے ہوں گے۔ پھر انہیں اتنی مہلت بھی نہ مل سکے گی کہ وہ وصیت کر سکیں یا اپنے گھروں کی طرف لوٹ سکیں۔ گویا انسان جن لوگوں کی وجہ سے اپنے فرائض سے غفلت برتتا ہے اسے جب موت آئے گی تو اتنی مہلت بھی نہ مل سکے گی کہ وہ ان سے وَصیّت کر سکے یا ان کی طرف لوٹ سکے۔

فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَّلَآ إِلَىٰٓ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ ﴿٥٠﴾

(پھر نہ تو یہ لوگ وصیت ہی کر پائیں گے نہ ہی اپنے اہل کی طرف لوٹ آنے کی استطاعت رکھتے ہوں گے)۔

اس آیت میں جس صیحۃ یا چنگھاڑ کا ذکر ہے اس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ نفخِ اولیٰ ہے جس سے سب لوگ مُردہ ہو جائیں گے اور اس کے بعد دوسرا صور پھونکا جائے گا جس کو سن کر مُردے زندہ ہو جائیں گے۔ اس لحاظ سے بعض علمائے (جن میں صاحبِ المیزان آقائے طباطبائی بھی شامل ہیں) اس آیت کو چوتھے رکوع میں شامل کیا ہے مگر ہمارے خیال میں یہ آیت تیسرے رکوع ہی میں شامل ہے۔ اور اسی مقام پر اس کی صحیح معنویت اُجاگر ہوتی ہے اس لیے کہ یہاں اس کے معنی نفخِ اولیٰ ہی کے نہیں ہیں بلکہ یہاں زیادہ زور تذکیر بالموت پر ہے جو دینی شعور کا ایک لازمی اور اہم حصّہ ہے۔ گویا انسان کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ زندگی جسے وہ پائیدار اور استوار سمجھ رہا ہے اس کی بُنیاد بہت کمزور ہے، اگر یہ زندگی قایم ہے تو یہ محض اللہ کی رحمت کے سبب قایم ہے اور جس وقت اس کا حکم ہوگا زندگی اس طرح ختم ہو جائے گی کہ انسان جن لوگوں کی خاطر اپنے فرائض سے غفلت برتتا ہے، اسے ان لوگوں سے وَصیّت کرنے کا موقع بھی نہیں مل سکے گا اور جنھیں وہ اپنا اہل سمجھتا ہے ان کی طرف لوٹ بھی نہیں پائے گا اور جن کی خاطر اس نے غفلت کی۔

صیحۃ کا یعنی چنگھاڑ کا جس جگہ ذکر کیا گیا ہے وہاں ایک حالت کا امرِ الٰہی سے اچانک اور اتفاقاً اور مکمل طور پر دوسری حالت میں بدلنا ہے جو پہلی حالت کا تتمہ یا نتیجہ ہے۔ دُنیا کا قیامت میں، زندگی کا موت میں، کسی قوم کے عروج کا زوال و تباہی میں بدلنا اس کا مقصد تذکیر بالعذاب الآخرہ یا تذکیر بالعقوبت یا تذکیر بالموت ہے۔

چوتھا رکوع

اَب ہمیں سورۂ یٰس کے چوتھے رکوع کا مطالعہ کریں گے! اس رکوع میں قیامت کی زندگی کا پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ قیامت کا یہ منظر اس سورے کے موت وحیات کے وسیع اور مجموعی منظر کا ایک لازمی حصّہ ہے۔

سورۂ یٰسین میں مَوت اور زندگی کی مختلف کیفیات اور سطحوں کو بیان کیا گیا ہے۔ مُوت اور زندگی کی ایک سطح طبعی زندگی کی سطح ہے' اِنسان جسمانی طور پر پیدا ہوتا ہے پھر اپنی مدّتِ حیات پوری کر کے مُوت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ مُوت اور زندگی کی ایک اور سطح وہ ہے جسے قلب کی غفلت اور آگاہی کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ قلب کی غفلت مُوت ہے اور قلب کی بیداری حیات ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے ظلمت اور نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ زندگی اور موت کی ایک اور سطح قوموں کی موت وحیات کی سطح ہے۔ جس کا ذکر اس سورۂ مبارکہ کے دوسرے رکوع میں کیا گیا ہے۔ پھر زندگی کی ایک اور سطح حیات بعد الموت کی سطح ہے۔ اس کے علاوہ زندگی اور مُوت کی ایک کیفیت وہ بھی ہے جو اس تمام دُنیا کے ختم ہونے اور اس کے بعد ایک نئے عالم کے ظہور سے عبارت ہے۔ اہم اور ضروری بات جو پیشِ نگاہ رکھنی ہے وہ یہ ہے کہ مُوت اور زندگی کی یہ تمام کیفیتیں جُدا جُدا نہیں ہیں بلکہ ان سب کے درمیان معنوی سطح پر بڑا گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ مُوت اور زندگی کے یہ تمام مشاہد اور مناظر مل کر ایک مکمل تصویر بناتے ہیں۔ ان میں سے ہر منظر اپنی جگہ بھی ایک وحدت ہے اور اس بڑی تصویر کا ایک حصّہ بھی ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں زندگی اور مُوت کے مختلف مناظر ایک وسیع

مناظر پیش کیے گئے ہیں اور ہر منظر ایک دھماکے کے ساتھ ختم ہوتا ہے وہیں جہاں منظر بدل رہا ہے یعنی زندگی کی ایک کیفیت ختم ہو کر دوسری کیفیت شروع ہو رہی ہے۔

سورہ مبارکہ یٰسین کا تیسرا اور چوتھا رکوع بہ اعتبار مضامین اس سورہ کے وسط کا حصّہ ہے۔ تیسرے رکوع میں آیات الٰہی کا ایک سلسلہ ہے جس سے دُنیا اور دُنیا میں انسانی زندگی کی ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ چوتھے رکوع میں قیامت کی زندگی کی منظر کشی کی گئی ہے جو اس دنیوی زندگی کا نتیجہ اور اس اعتبار سے اس سے پوری طرح مربوط ہے۔ تیسرے رکوع میں جو کیفیات بیان کی گئی ہیں یعنی مُردہ زمین کا زندہ ہونا۔ اس سے اناج اور پھلوں کا اُگنا۔ نہروں کا جاری ہونا۔ انسانوں کا زوج زوج پیدا کیا جانا یہی تمام کیفیات چوتھے رکوع میں قیامت کے بعد کی زندگی کے حوالے سے نظر آتی ہیں یعنی زندگی۔ باغ۔ نہریں اور سائے۔ فواکہ۔ ازواج اور سلامتی۔ البتہ ان کی سطح نسبتاً مختلف ہے۔ گویا دُنیا اور آخرت کوئی مختلف حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان گہرا ربط اور ہم آہنگی (CORRESPONDENCE) ہے۔

قیامت لازمی ہے:

چوتھے رکوع میں قیامت کا ذکر ہے۔ قیامت پر اعتقاد ہر دین کا ایک لازمی حصّہ ہے۔ ہر دین میں دو اُصول مُشترک ہیں۔ یعنی حیات بعد الموت (RESURRECTION) کا عقیدہ اور مکافاتِ عمل پر اعتقاد۔ قرآن جسے دینِ قیّم کہتا ہے اس کی بُنیاد دو عقائد اور حسنِ عمل پر ہے یعنی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان اور اچھے اعمال۔ اس اعتبار سے قیامت کا عقیدہ ہر دین میں ایک لازمی عقیدہ ہے۔ اسی طرح یہ اسلام کے بُنیادی اُصولوں میں سے ایک اُصول ہے۔

قیامت کے عقیدے کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اللہ پر یقین کا ایک لازمی تقاضا ہے بالفاظ دیگر اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہیں۔ قیامت کا عقیدہ انسانی زندگی کو مقصدیت اور معنویت عطا کرتا ہے اس کے لیے ایک ہدف اور ایک منزل مُقرر کرتا ہے۔ زندگی ایک ایسا سفر نہیں ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ اس کو حق کے ساتھ

خلق کیا گیا ہے اور یہ قیامت کا عقیدہ ہی ہے جو اس دُنیا میں انسانی زندگی کو جو کشمکش، جدوجہد، ناکامیوں اور کامیابیوں کے تضاد سے عبارت ہے جواز عطا کرتا ہے۔ اس لئے کہ یہ دُنیا دار الامتحان ہے اور آخرت دار الجزاء، اور دار الجزاء کے بغیر دار الامتحان کو کوئی اعتبار حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ خیر و شر کی رزم گاہ ہے۔ یہاں حق اور باطل ملے جلے ہیں یہاں ہر انسان کو اس کے عمل کا پُورا نتیجہ نہیں ملتا۔ یہ دُنیا ناقص ہے۔ قیامت دار الجزاء ہے جہاں اس دُنیا کے نقص دُور ہو جائیں گے اور ہر انسان کو اس کے ہر عمل کا خواہ اچھا ہو یا بُرا پُورا پورا نتیجہ مل جائے گویا قیامت کی زندگی، دُنیاوی زندگی کی تکمیل کرتی ہے۔ دُنیادی زندگی کو (۱) مقصد (۲) معنی اور (۳) جواز فراہم کرتی ہے۔

دُنیا کے لفظی معنوں میں دو رُخ ہیں یعنی نزدیکی اور پستی۔ یہ اصطلاح لفظی معنوں کے اعتبار سے بھی اضافی ہے یعنی دُنیا اور آخرت کا ذکر ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

ایک اور رُخ سے دیکھا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ کلام پاک میں انسانی فطرت کی جو حدود بتائی گئی ہیں وہ اعلیٰ علیین سے اسفل السافلین تک پھیلی ہوئی ہیں اور انسانی فطرت کا یہ پھیلاؤ (RANGE) بذاتِ خود جنّت اور جہنّم کے لزوم پر دلالت کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قیامت پر اعتقاد دینی شعور کا لازمی اور اساسی حصّہ ہے۔

قیامت یوم الفصل ہے:

کلام پاک میں دُنیاوی زندگی اور آخرت کی زندگی کا جو تقابل پیش کیا گیا ہے وہ نہایت واضح اور روشن ہے دُنیا میں انسان کی زندگی تضاد اور تصادم سے عبارت ہے، زندگی میں حرکت اور ارتقاء اسی تصادم سے عبارت ہے لیکن ہر تصادم کو حق اور باطل کا تصادم نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ اس دُنیا میں حق اور باطل باہم مخلوط ہیں اور عام طور پر ناقص حق، ناقص باطل سے ٹکراتا رہتا ہے۔ حق کو باطل سے جُدا کرنے کا کام رسول یا امام انجام دیتے ہیں۔ اسی لئے رسول کی بعثت یا امام کے ظہور کو قیام بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایام اللہ کا وہ

زمانہ ہوتا ہے جب حق اور باطل جُدا جدا ہو جاتے ہیں ورنہ اس دُنیا کی کیفیت یہ ہے کہ یہاں حق اور باطل میں صرف آویزش ہی نہیں آمیزش بھی ہے اور دُنیا کی یہ کیفیت اس لئے ہے کہ یہ دُنیا دارالامتحان ہے اور دارالامتحان کی یہی کیفیت ہو سکتی ہے اور اس دُنیا میں اِنسان کی زندگی کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے لئے نہ صرف حق اور باطل میں تمیز کرنا مشکل ہے بلکہ خود اس کی اپنی حقیقت بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہے۔ یہ زندگی، حجابات، غفلت اور اُلجھاؤ (CONFUSION) سے عبارت ہے۔ یہاں اِنسان کی صحیح حقیقت اور حیثیت اس کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت اور اس کا کرم ہے کہ اس نے حقیقتوں پر پردہ ڈال رکھا ہے ورنہ اگر یہ حجابات اُٹھ جائیں تو یہیں اہل جنّت اور جہنم کی تفریق ہو جائے۔ قیامت زندگی کی وہ کیفیت ہے جس میں حق اور باطل، جنّت اور دوزخ واضح طور پر علیحدہ ہیں، پیمبر یا امام کے قیام اور قیامت میں بڑی گہری مماثلت ہے۔

اِنسانی زندگی کی دو سطحیں ـــــ ظاہر اور باطن

اس دنیا میں اِنسانی زندگی دو سطحوں پر چلتی ہے، ظاہر کی سطح اور باطن کی سطح۔

زندگی کا دائرہ بہت وسیع ہے اس میں اِنسان کی تمنائیں۔ نیتیں۔ عقیدے۔ جذباتی لگاؤ اور کشش، اس کے ارادے، سعی و عمل، حسرتیں اور ناکامیاں اور کامیابیاں سب ہی شامل ہیں۔ خارجی دُنیا میں ارادہ اور عمل کے مابین، سعی اور اس کے نتیجے کے مابین حالات اور ماحول کے بہت سے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں اور کبھی کبھی یہ اثر اتنا سنگین ہو جاتا ہے کہ ایک مردِ خدا کے عزائم فسخ ہو جاتے ہیں اور اِنسان حالات اور ماحول کے دباؤ کے تحت وہ حاصل نہیں کر سکتا جس کی وہ تمنا کرتا ہے۔ ظاہری سطح پر زندگی میں کامیابیوں یا ناکامیابیوں کا سلسلہ بہت کچھ خارجی حالات اور ماحول کے اثرات پر منحصر ہوتا ہے اسی لئے اللہ نے اِنسانی زندگی کو ناپنے کا پیمانہ سعی کو قرار دیا ہے جس کا تعلق اِنسان کی نیت اسکے

ارادوں اور اُمنگوں سے ہے سعی کے نتیجہ کو نہیں جو اللہ کے ہاتھ ہے۔ انسان کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس کے خواب زندگی کی عملی حقیقتوں سے ہمیشہ بلند ہوتے ہیں۔ حضورؐ نے غارِ حرا میں جو خواب دیکھا تھا وہ ابھی تک پوری طرح شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔

انسان اس دُنیا میں جو کچھ کر رہا ہے یا جو کچھ نہیں کر رہا خارجی سطح پر اس کا تعلق حالات اور ماحول سے ہے اور داخلی سطح پر اس کا تعلق خود انسان کے اپنے نفس سے ہے۔ ہمارے ہر عمل یا عمل سے گریز کے نتیجہ میں ہمارا نفس بن رہا ہے یا بگڑ رہا ہے۔ بہتر ہو رہا ہے یا بدتر ہو رہا ہے، بلندی کی طرف سفر کر رہا ہے یا پستی کی طرف رد ہو رہا ہے۔ گویا وقت کا یہ پاٹ چل رہا ہے اور اس کی گردش ہر ظرف کو کسی نہ کسی سانچے میں ڈھالتی جا رہی ہے۔ ان ہی حوادث میں آدمی بن یا بگڑ رہا ہے۔ آدمی کو ناپنے کا دُنیاوی پیمانہ یہ ہے کہ اس نے کیا کمایا ہے کیا حاصل کیا ہے۔ (WHAT HE HAS) جبکہ دین کا پیمانہ یہ ہے کہ اس کے نفس نے کیا کمایا یعنی اس نے خود کو کیا بنایا ہے (WHAT HE IS)

عاجلہ اور عاقبہ:

زیادہ تر انسان حیاتِ دُنیا کے جال میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں، راحت، دولت، اقتدار، شہرت ان کی زندگی کا نصب العین ہوتا ہے۔ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ ہر دَور میں دنیوی کامیابی یا ناکامی کا ایک دستور ہوتا ہے جو اس دور کے مخصوص سماجی اور سیاسی حالات سے تشکیل پاتا ہے۔ اخلاقی قدر سے قطع نظر اس بات سے کہ ان مقاصد کو زندگی کا ہدف بنا لینا خود اخلاقی لحاظ سے بہت پست و مذموم فیصلہ ہے۔ جب کوئی انسان اس دستور کو سمجھ لیتا ہے اور زمانہ اس کی جو قیمت مانگتا ہے وہ ادا کرنے پر تیار ہو جاتا ہے تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے اور زمانہ اسے کامیابی کا سرٹیفکٹ دے دیتا ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اس کو عاجلہ کہتے ہیں لیکن مردانِ خدا کا ہدف زندگی راحت اور دولت و اقتدار نہیں ہوتا بلکہ کیسا ہی زمانہ کیوں نہ ہو ان کی زندگی کا راستہ ایمان

اور عمل صالح اور تواصوبالحق اور تواصوبالصبر ہے۔ اور اس کا نتیجہ خواہ دینوی اعتبار سے شکست ہی کیوں نہ ہو لیکن ہر جبر اور دباؤ اور لالچ کے باوجود انتہائی ایثار اور قربانی کے ساتھ صراط مستقیم پر قائم رہنا عاقبہ کی کامیابی ہے۔

عاجلہ کامیابی بہت جلد مٹنے والی ہے۔ اور اس کا حساب اللہ کے ہاتھ ہے۔ عاقبہ کامیابی صرف عاقبت ہی میں انعام نہیں ہے بلکہ انسانی شرف کی قائم رہنے والی دل کی ایک دھڑکن ہے۔ جناب امیر علیہ السلام کی حکومت کا زمانہ یہ وہ دور تھا جب قبائلی عصبیتوں اور مال و دولت کی ہوس نے معاشرے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس وقت عاجلہ کامیابی کا راستہ وہی تھا جو امیر معاویہ نے اختیار کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت علیؑ جیسا انسان جو وقت کی اطاعت کرنے والا نہیں تھا بلکہ وقت کا احتساب کرنے والا تھا سیاسی اعتبار سے ناکام ہو گیا۔ لیکن حضرت علیؑ کی نگاہ اور خدا کے نزدیک ان کی سیاسی ناکامی ہی ان کی کامیابی تھی جس وقت آپ ابن ملجم کی ضرب سے زخمی ہوئے تو اس موقع پر آپ نے رب کعبہ کی قسم کھا کر کہا کہ میں کامیاب ہو گیا۔ فُزتُ بِرَبِّ الکَعبہ ۔ یہ عاقبہ کامیابی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں دین اور دنیا کی کامیابی کے دونوں معیار ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ جو لوگ عاجلہ یعنی دنیاوی کامیابی کے طلبگار ہوتے ہیں انہیں جب چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے اور جو لوگ آخرت کے طلب گار ہوتے ہیں اور وہ مومن ہوں تو ان کی سعی مشکور ہے جو لوگ الحیٰوۃ الدنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں وہ لوگ آخرت سے غافل ہیں۔

لوگ عاجلہ سے محبت کرتے ہیں اور آخرۃ کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ جو کوئی عاجلہ کا طلبگار ہوتا ہے تو ہم جو چاہتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں اسی دنیا میں دے دیتے ہیں اور جو آخرت کا طلبگار ہے اور اس کے لئے مناسب سعی کرتا ہے اور مومن ہے تو اس کی سعی مشکور ہے۔ اسی حقیقت میں اہم بات یہ شعور حاصل کرنا ہے کہ دنیا اور آخرت دو الگ الگ حقیقتیں بلکہ عاقبہ یعنی

آخرت کی جہت عاجلہ یعنی دُنیا کے ساتھ ساتھ مربوط ہے۔ انسان اپنے ہر عمل یا عمل سے اغماض کے نتیجہ میں بنتا یا بگڑتا جارہا ہے گویا انسان ہر لحظہ عرصہ محشر میں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے انسان کی حقیقتِ حال پر ستاری کا پردہ ڈال رکھا ہے لیکن جب لوگوں کے قلب بیدار ہوتے ہیں وہ ہمیشہ خود کو اسی طرح دیکھتے ہیں جیسے وہ قیامت میں ہوں۔ مولانا جلال الدین رومیؒ نے فرمایا:

پس قیامت شو، قیامت را ببیں   دیدن ہر چیز را شرط است ایں

اس تمام گفت گو کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت دینی شعور کا ایک لازمی حصہ ہے، حیات بعد الموت اور مکافاتِ عمل کا تصور ہر دین کی قدرِ مشترک ہے۔ قرآن نے جس چیز کو دین قیم کہا ہے اس کے دو بنیادی عقیدے ہیں۔ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان۔ دراصل یوم آخرت پر ایمان کے بغیر اللہ پر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ عقیدۂ قیامت، عقیدۂ توحید کا ایک لازمی تقاضا ہے، اسلام کے اصولِ دین میں قیامت شامل ہے قیامت کے عقیدے کے بغیر زندگی ایک ایسا سفر ہے جس کی کوئی منزل نہیں، قیامت کا عقیدہ زندگی کی مقصدیت اور معنویت کو معین کرتا ہے، اور دنیاوی زندگی کی خامیوں اور نقائص کا جواز فراہم کرتا ہے انسان دُنیا میں جو کچھ عمل کرتا ہے اس کا پورا پورا بدلہ قیامت میں ملے گا، جہاں وہ اپنی صحیح حقیقت میں ظاہر ہوگا۔ اسلام کی تعلیمات کے مطابق دُنیا اور آخرت دو الگ الگ حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ انسانی زندگی میں عاجلہ اور عاقبہ کی جہتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں ہر عمل کا ایک فوری اور خارجی اثر پیدا ہو رہا ہے اور ایک داخلی اور قائم رہنے والا اثر پیدا ہو رہا ہے۔ اس لحاظ سے قیامت کا عقیدہ ہر لحظہ آگاہی اور خود احتسابی کی دعوت دیتا ہے۔

قیامت: قرآنی منظر

سورۂ یٰسین کے چوتھے رکوع میں قیامت کا منظر نفخ صور سے شروع ہوتا ہے جس کے اثر سے یہ ارض و سماوات فنا ہو جائیں گے اور ان کی جگہ دوسرے زمین و آسمان ظاہر

ہوں گے۔ کلام پاک میں اسے نشاۃ آخر یا خلقتِ جدید سے تعبیر کیا گیا ہے اس دن زمان و مکان کی کیا کیفیت ہو گی اس کے بارے میں ہمیں نہیں معلوم۔ البتہ ہمیں انسان کی کیفیت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس دن وہ بہت زیادہ دیکھنے اور سننے والا بن جائے گا اس کے حواس بہت تیز ہو جائیں گے اس کی قوت ادراک بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ تمام حجابات اُٹھ جائیں گے۔ تمام باتیں ظاہر ہو جائیں گی۔ انسان اپنی کتاب نفس کو پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت حاصل کرے گا۔ یہ کتاب نفس جو اس نے خود تحریر کی ہے اس کے سامنے آجائے گی۔ وہ اپنی اچھائیوں اور بُرائیوں کو اپنی محبتوں اور نفرتوں کو خود دیکھ لے گا۔

قیامت کا دن وہ ہو گا جب اللہ تعالیٰ کے مالک الملکوت ہونے کی شان پوری طرح ظاہر ہو جائے گی۔ وہ مالک الملک بھی ہے اور مالک الملکوت بھی ہے۔ دُنیا میں اللہ تعالیٰ کے مالک الملک ہونے کی شان عیاں اور مالک الملکوت ہونے کی شان نہاں ہے۔ اب ملکوت میں ملک ظاہر ہو رہا ہے۔

قیامت یوم جزا اور یوم الفصل ہے اس دن حق اور باطل بالکل الگ الگ کر دیئے جائیں گے دُنیا میں حق اور باطل کے گروہ ایک دوسرے سے مخلوط ہیں قیامت میں انہیں ایک دوسرے سے ممتاز کر دیا جائے گا۔

قیامت یوم حساب ہے اس دن انسان فرادیٰ موقف حساب میں کھڑا کیا جائے گا۔ تمام تعلقات اور اضافتوں سے کٹ کر انسان اپنی اصلی حالت میں آجائے گا۔

اس دن گواہی قول کی نہیں بلکہ عمل کی قبول ہو گی، انسان کی سمع، بصر، اس کے ہاتھ اور پاؤں اور اس کی جلد اس کے خلاف گواہی دے گی۔

قیامت کا دن یوم الحق ہے جب حق پوری طرح ظاہر ہو جائے گا۔

قیامت یوم الدین ہے جب یہ زمین اور آسمان بدل جائیں گے، اور انسان کی کیفیت بالکل تبدیل ہو جائے گی یوم الفصل ہے جب حق اور باطل ایک دوسرے سے جُدا کر دیئے جائیں گے۔

اور یہ وہ دن ہے جب مبدا اور معاد ایک ہو جائیں گے۔ تمام مخلوقات اپنے خالق کی طرف رجوع ہو جائیں گی۔

زیرِ مطالعہ رکوع میں جو مضامین بیان کئے گئے ہیں ان کا خاکہ اس طرح کا ہے کہ جب صُور پھُونکا جائے گا تو مُردے اپنی قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے، اس دن ہر شخص کو اس کے عمل کا پُورا پُورا بدلہ دیا جائے گا۔ اس دن حق اور باطل کے گروہ الگ الگ کر دیئے جائیں گے۔ اہلِ حق کی جگہ جنّت ہو گی اور اہلِ باطل کا ٹھکانہ جہنّم۔ کلام پاک میں اس کے لئے باغ اور آگ کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔

اہلِ جنّت کی حالت خوشی اور اطمینان کی حالت ہو گی۔ انہیں پاکیزہ ساتھی فراہم کئے جائیں گے اور ان کا اطمینان اور سکون اس منزل پر ہو گا جسے سَلٰمٌ قَوْلاً مِّن رَّبٍّ رَّحِیْمٍ کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔

اس کے برعکس مجرمین پر اللہ تعالیٰ اپنی حُجّت پوری کرے گا۔ انہیں اپنا وہ وعدہ یاد دلائے گا کہ اے بنی آدمؑ کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہیں کرو گے بلکہ میری پرستش کرو گے، پھر اللہ تعالیٰ اس بات کو جتلائے گا کہ میں نے تمہاری ہدایت بھی کی تھی اور تمہیں ہدایت کو قبول کرنے کے لئے عقل بھی دی تھی لیکن تم نے عقل سے کام نہ لے کر ہدایت کا انکار کیا۔ اب جب حجّت پوری ہو گئی تو تمہارا ٹھکانہ وہی جہنّم ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اور یہ تم پر ظلم نہیں ہے بلکہ یہ عین تقاضائے انصاف ہے، اس دن انسان کی زبان پر مُہر ہو گی، اس کے ہاتھ پاؤں اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ اصحابِ جہنّم وہ ہیں جنھوں نے عقل و بصارت سے کام نہیں لیا۔ جو ہدایت کا انکار کرتے رہے اور جنہیں قیامت پر اعتقاد نہیں تھا اس کے برعکس اصحابِ جنّت وہ ہیں جنہوں نے تفکّر سے کام لیا، ہدایت کو قبول کیا، جو تقویٰ اختیار کرنے والے، بھوکوں کو کھانا کھلانے والے اور قیامت پر اعتقاد

رکھنے والے ہیں۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ إِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ (۵۱)

(اور جب صور پھونکا جائے گا تو وہ اپنی قبروں سے اپنے رب کی طرف چل کھڑے ہوں گے)

زندگی کی ایک کیفیت کے ختم ہونے اور دوسری کیفیت کے شروع ہونے کے منظر کا تعلق نفخ صور سے ہے۔

تیسرے رکوع کا اختتام صیحۃ واحدۃ پر ہوتا ہے۔ یہ وہ دھماکہ ہے جس کے ساتھ زندگی قطع ہو جاتی ہے۔

اب چوتھے رکوع کا آغاز نفخ صور سے ہو رہا ہے۔ اس دھماکے کے نتیجے میں زندگی کی ایک نئی کیفیت نمود کر رہی ہے اور نئے زمین و آسمان ظاہر ہو رہے ہیں اور انسانی زندگی کی ایک بدلی ہوئی کیفیت پیش کی جا رہی ہے۔ نفخ صور کے بعد "خلق جدید" اور "نشاۃ اُخریٰ" ہے۔

جب صور پھونکا جائے گا تو مُردے قبروں سے نکل کر اپنے پروردگار کی طرف دوڑ پڑیں گے۔

اجداث وہ حالت ہے جس میں انسان دُنیاوی زندگی کے بعد ہو گا۔ نفخ صُور کے نتیجہ میں تمام مُردے وہ جس حالت میں بھی ہوں اپنے رب کی طرف دَوڑ پڑیں گے۔ یہ عالم برزخ سے حضوریٔ رب کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ رجوع کرنے کا منظر ہے۔ یُوں تو ہر مخلوق ہر لمحہ اپنے رَب کی حضوری میں ہے مگر یہ وہ موقعہ ہے جب تمام حجابات اُٹھ جائیں گے اور ہر انسان خود کو براہِ راست اپنے رب کی حضوری میں کھڑا ہوا پائے گا۔

ینسلون میں تیز رفتاری کے ساتھ سراسیمگی کا مفہوم بھی شامل ہے۔ یہ کیفیت یا تو عام ہے کہ ایک حالت سے دوسری حالت میں پلٹنا ہے یا خاص طور پر کافروں کی ہے جو قیامت کا انکار کرتے رہے ہے برخلاف مومنوں کے جو لقائے رَب کے مشتاق رہے۔

قَالُوا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ
الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا
مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

(وہ کہیں گے ہائے افسوس ہم پر ہمیں ہمارے مرقد سے کس نے اُٹھا دیا۔ یہی وہ ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور مرسلین نے سچ کہا تھا وہ تو بس ایک چنگھاڑ ہوگی پھر یہ سب کے سب لوگ ہمارے حضور میں حاضر کئے جائیں گے)۔

اس آیت میں بھی یا تو عام طور پر انسانوں کا ذکر ہے، موت سے زندگی کی طرف آنے میں بھی ایک کرب ہے یا اس آیت میں ان لوگوں کی حالت کی نقشہ کشی کی گئی ہے جو اس دُنیا میں قیامت کا انکار کرتے رہے اس کی طرف سے غافل رہے اب جبکہ وہ حقیقت بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آگئی ہے تو ان کے لئے حیرانی اور سراسیمگی کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ لوگ ابتک ایک غفلت کے عالم میں تھے۔ غفلت کی حالت خواب کی کیفیت ہوتی ہے۔ اب یہ غفلت دُور ہو رہی ہے۔ شعور جاگ رہا ہے۔ یہ خواب سے بیداری کی طرف رجوع کرنے کی کیفیت ہے۔ حیاتِ دُنیا کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ خواب کی حالت ہے۔ لوگ سو رہے ہیں۔ جب موت آئے گی تو وہ بیدار ہوں گے۔ دُنیا کے مقابلے میں برزخ کی کیفیت خواب کے مقابلے میں بیداری کی کیفیت ہے۔ لیکن برزخ میں شعور کی بیداری کا عمل شروع ہوتا ہے اور اس عمل کی تکمیل قیامت میں ہوگی جب تمام حجابات اُٹھ جائیں گے اور شعور پوری طرح جاگ اُٹھے گا۔ گویا برزخ درمیانی کیفیت ہے۔ دُنیا کے مقابلے میں یہ بیداری کی کیفیت ہے لیکن قیامت کے مقابلے میں یہ خواب کا عالم ہے۔ مرقد کے معنی ہی خواب گاہ کے ہیں۔ مرقد لفظ رقد سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ہلکی نیند کا عالم، اور بعث کے معنی ہیں نیند سے جگا کر کھڑا کرنا اور کسی راستہ پر ہاتھ پکڑ کے چلانا۔ مُردے مرقدوں میں نیند کی حالت میں ہوں گے۔ صُور کے دھماکے سے وہ اُٹھ کھڑے ہوں گے

اور تیزی سے اپنے رب کی حضوری میں حاضر ہونے کے لئے دوڑ پڑیں گے۔

اس آیت میں اِلیٰ رَبِّهِم کہا گیا ہے۔ یہاں لفظ رب کے استعمال کی ایک خاص معنویت ہے۔ اسی طرح اس کے فوراً بعد کہا گیا ہے هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ۔ یہاں بھی لفظ رحمٰن خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ مشرکین عرب اللہ کو 'رب' اور 'رحمٰن' ماننے سے انکار کرتے تھے۔ کلام پاک میں مشرکینِ عرب کے متعلق کہا گیا ہے کہ اگر ان سے پوچھا جائے کہ اس زمین اور آسمان کو کس نے خلق کیا ہے، کون ہے جو اس نظام تکوینی کو چلا رہا ہے تو وہ جواب دیں گے "اللہ"۔ گویا عہد جاہلیت کے عرب اللہ پر عقیدہ رکھتے تھے مگر ان کی خرابی یہ تھی کہ وہ اللہ پر عقیدہ رکھنے کے باوجود ارباب من دون اللہ کے قائل تھے، وہ شرک کرنے والے تھے، وہ اللہ کو رب نہیں مانتے تھے۔ اسی طرح وہ اللہ کو رحمٰن تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اسی تناظر میں یہاں خاص طور پر 'رب' اور 'رحمٰن' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم کی سب سے پہلے نازل شدہ سورۂ اقراء کی ابتدائی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کا اسم اللہ سے نہیں بلکہ اس کی ربوبیت، خالقیت اور رحمانیت کی صفات سے ذکر کیا گیا ہے۔

ویل کرب کا وہ عالم ہے جو موت سے زندگی یا زندگی سے موت کی کیفیت میں تبدیلی کے وقت طاری ہوتا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس پر ایک کرب کا عالم طاری ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان جب مرتا ہے تو وہ کرب کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ کرب کیفیت کی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ قیامت میں مردے موت سے زندگی کی نئی کیفیت میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان کی نیند کا وقفہ ختم ہو رہا ہے۔ اب شعور بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ تمام حقیقتیں بے حجاب ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کیفیت سے وہ کرب محسوس کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ یٰویلنا ائے ہماری خرابی ہمیں کس نے اپنی خواب گاہوں سے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ یہ حیرانی اور سراسیمگی کی کیفیت ہے۔

یہ تمام آثار بعث کا انکار کرنے کی وجہ سے ان کے نفوس پر ظاہر ہوئے ہیں۔ پھر جب قبر سے اُٹھ کر محشر یا مقام حساب تک جاتے ہیں تو اس عالم میں ہیں کہ انھیں کسی بھلائی کی اُمید نہیں ہے اور ان پر فزع اکبر طاری ہے۔

پھر انھیں یاد آتا ہے یہ ان کے بدلے ہوئے سمع اور بصر ہیں جو اب بہت تیز ہو گئے ہیں اور جن سے غفلت کے پردے اب ہٹ چکے ہیں۔

اب خود ان کی زبان پر رحمٰن کا لفظ جاری ہوتا ہے اور ان کو رحمٰن کا وعدہ اور رسولوں کا قول یاد آتا ہے۔ رحمٰن کا لفظ ان کی زبانوں پر جاری ہونا ان کی سمع و بصر کی حیاتِ نو کی دلیل ہے۔

کیا رحمٰن کے لفظ میں اپنے علم و تقصیر کا اعتراف اور اللہ کی رحمت سے اپیل بھی ہے۔

کیا مُرسلین کے قول کی تصدیق کرنے میں ان کی شفاعت سے توقع بھی مضمر ہے۔

هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ کی تفسیر دوسرے انداز سے اس طرح کی گئی ہے کہ یہ کافروں اور مشرکوں کا قول نہیں ہے بلکہ گناہ گار جب حیرانی کے عالم میں یہ کہیں گے کہ ہمیں ہمارے مرقدوں سے اُٹھا کر کس نے کھڑا کر دیا تو ان کو جواب دیا جائے گا کہ یہ وہی ہے جس کا تم سے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور جس کی خبر اس نے اپنے رسولوں کے ذریعے دی تھی۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صیحۃ واحدہ نفخِ صُور کے بعد کی چنگھاڑ ہے جس کے نتیجہ میں تمام لوگ اپنے رب کے حضور جمع ہو جائیں گے۔

لیکن زیادہ صحیح توجیہ یہ ہے کہ مُردوں کا زندہ ہونا۔ ان کا اپنے مرقدوں سے کھڑا کیا جانا۔ نیند سے چونک اُٹھنا۔ ان کے شعور کا بیدار ہونا اور سب کا اپنے رب کے حضور جمع ہو جانا یہ تمام باتیں اللہ تعالیٰ کے حوالے سے گویا ایک آنِ واحد، ایک صیحۃ واحدہ

میں ہو رہی ہیں۔

اس سے قبل کی آیت میں مجرمین کا ذکر تھا۔ اس آیت میں قیامت کی عمومی کیفیت بیان کی جا رہی ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ نشاۃ آخرۃ یا خلق جدید کے تمام مراحل، شعور کی بیداری کی تمام کیفیات جنھیں انسان کے سمجھانے کے لئے الگ الگ بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ سب ایک صیحۃ واحدہ کے نتیجہ میں یکلخت ظاہر ہو رہی ہیں۔ خلق اور بعث دونوں کنفسٍ واحدہ ہے۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۵۴﴾

(آج کے دن کسی نفس پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا اور تمہیں ویسا ہی بدلہ ملے گا جیسا تم عمل کیا کرتے تھے)۔

اس دن کسی نفس پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا بلکہ ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا ملے گی۔ اس آیت میں الیوم سے مُراد کوئی مخصوص دن نہیں ہے اس لئے کہ قیامت میں زمان و مکان بدل جائیں گے اور اس عالم کے وقت کی کیفیت کے متعلق ہمیں اندازہ نہیں ہے۔ اس لئے یہاں الیوم سے مُراد وہ کیفیت ہے جہاں کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ یہ دُنیا نہیں ہے جہاں لوگوں پر ظلم کیا جا سکتا ہے بلکہ یہ آخرت ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے یہاں کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا یہاں جزا یا سزا عمل کے مُطابق ہے۔

عمل سے مُراد صرف فعل (ACTION) ہی نہیں ہے بلکہ اس میں انسان کی نیت، ارادہ، دُعائیں، تمنائیں، آرزوئیں اور انتظار سبھی کچھ شامل ہے۔ (اس سے مُراد انسانی زندگی کا رُخ ہے۔ انسان اپنی صلاحیتوں کو جس طرح استعمال کرتا ہے اس کا نفس اسی حساب سے بنتا یا بگڑتا جاتا ہے) اس دُنیا میں انسان کی کیفیت یہ ہے کہ ہر آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال ہے۔ ہر آدمی کی ایک باطنی دُنیا ہے جس میں اس کے ارادے، اس کی تمنائیں، اس کی اُمیدیں، اس کی آرزوئیں، اس کی دُعائیں اور اس کے خواب سبھی کچھ شامل ہیں۔ انسان ظاہر میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ اس باطنی حقیقت کی

ایک معمولی سی جھلک ہوتی ہے اور بسا اوقات یہ ہلکی سی جھلک بھی حالات اور ماحول کے دباؤ سے مسخ ہو جاتی ہے۔ اس دُنیا کی صورت یہ ہے کہ یہاں انسان کی نیت اور عمل، خواب اور حقیقت اور دُعا اور اثر میں بُعد اور تفاوت پایا جاتا ہے۔ گویا تَعْمَلُوْنَ" سے مراد انسان نے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں اور توانائیوں کو جس طرح استعمال کر کے جو کچھ اپنے آپ کو بنایا ہے۔ قیامت میں یہی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔ یہاں کسی نفس پر کسی ظلم کا کوئی سوال نہیں ہے اس لئے کہ یہاں انسان اپنی جس حقیقت کو دیکھ رہا ہے اسے اس نے خود بنایا ہے، اسے جس نامۂ اعمال کے مطابق جزا اور سزا مل رہی ہے اسے اس نے خود تحریر کیا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ اس دن کسی نفس پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اور یہ دعویٰ برہان کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ قیامت میں ہر شخص کو اس کا صحیح مقام حاصل ہو جائے گا۔ یہ دُنیا کی زندگی ہے جہاں یہ ظلم ممکن ہے کہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے محروم کر دیا جائے یا لوگ اس مقام کو حاصل کریں جس کے وہ اہل نہیں ہیں قیامت تو قایم ہی اس لئے کی جائے گی کہ ہر نفس اپنے صحیح مقام پر فائز ہو جائے اور یہی عَدل کے معنی ہیں جس عالم کے قیام کا مقصد ہی قیام عدل ہو۔ بھلا وہاں کسی ظلم کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

اس مسئلے کو ایک اور رُخ سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر عمل انسان سے علیحدہ حقیقت مانا جائے تو بھی عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ بُرائی کی سزا بُرائی سے زیادہ نہ ہو اور نیکی کی جزا اس سے کم نہ ہو۔ قیامت میں جو میزانِ عدل قایم کی جائے گی اس میں بُرائی کا بدلہ اسی کے مُطابق دیا جائے گا یعنی سزا گناہ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ البتہ نیکی کا بدلہ بڑھا کے دیا جائے گا۔ گویا نیکی کی جزا اس سے کم نہیں ہوگی بلکہ اسے دس گنا بڑھا دیا جائے گا۔ اس لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو بھی یہی کہا جائے گا کہ اس دن کسی نفس پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا اور ہر شخص کو اس کے عمل کے مُطابق بدلہ دیا جائے گا۔

اصحابِ جنّت اور اصحابِ جہنّم

اَب ہمارے سامنے دو تصویریں آتی ہیں ایک اصحابِ جنّت کی تصویر اور دوسری اصحابِ جہنّم کی تصویر۔ ان کے استعارے باغ اور آگ ہیں اور یہ استعارے کلامِ پاک میں جگہ جگہ اور کثرت سے استعمال ہُوئے ہیں۔

اصحابِ جنّت کی تصویر ایک ایسی زندگی کی تصویر ہے جس میں باغات ہیں، نہریں ہیں، زندگی بہتے ہوئے پانی کی طرح صاف وشفّاف ہے، چشموں کی طرح اُبل رہی ہے، زندگی پر شباب کا عالم ہے اور یہ شباب ہمیشہ قایم رہنے والا ہے۔

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾

(بیشک اِس دن اصحابِ جنّت خوش خوش کاموں میں مصروف ہوں گے وہ اور انکے ازواج (جوڑے۔ ساتھی) سایہ میں تخت پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے)۔

اصحابِ جنّت ایسے مشغلوں میں مصروف ہوں گے جسے شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ کہا گیا ہے۔ شغل سے مراد دلچسپی کا ایسا کام جو دوسرے کاموں سے بے نیاز کر دے اور فٰكِهُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ یہ مصروفیت ان کے لئے سُبک ہوگی، ان پر کوئی گرانی یا مشقت طاری نہیں ہوگی۔ اصحابِ جنّت نہ بے کار ہوں گے کہ بوریت کا شکار ہوں اور نہ ان کی مصروفیت ایسی ہوگی جس سے انہیں گرانی کا احساس ہو۔ بلکہ وہ اپنی دلچسپی کے سُبک کاموں میں مصروف ہوں گے۔ ان کے کاموں سے انہیں مسرّت حاصل ہوگی ایسا کام جس میں فائدہ اور خوشی دونوں ہوں جنّت کا انعام ہے۔

یہ لوگ تنہائی کا شکار نہیں ہوں گے بلکہ انہیں پاکیزہ ساتھی عنایت کیے جائیں گے ہم مذاق ہم صحبت ہوں گے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ظلال یعنی سائے میں بیٹھے ہونگے۔

ضلال کی بھی دو کیفیتیں ہیں جنہیں سایہ اور چھاؤں (SHADOW , SHADE) کہہ سکتے ہیں۔ جنّت پر عالمِ قدس کا سایہ اسی طرح چھایا ہوا ہے جیسے زمین پر آسمان کا سایہ۔ اور جنّت میں ہر طرف گھنے درختوں کی چھاؤں ہے۔ اہلِ جنّت اسی ضلال میں متمکن ہوں گے۔ تمازت سے محفوظ، جنّت کے درختوں کی چھاؤں میں، حقیقت اور سلامتی کے سایہ میں، وہ تخت پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ یہ اندازِ نشست/ راحت و آرام کے ساتھ ساتھ عزّت و سلطان کی نشاندہی کرتا ہے۔

لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُمْ مَا يَدَّعُونَ ﴿۵۷﴾

"ان کے لئے اس میں پھل ہوں گے اور ان کے لئے موجود ہوگا جو کچھ وہ طلب کریں گے"

اصحابِ جنّت کو جنّت میں پھل عطا کئے جائیں گے۔ یہ پھل ان کے نیک اعمال کے ثمر ہوں گے اس لئے وہ ان کے ذائقہ اور خوشبو سے واقف ہوں گے اور ان کو وہ عطا کیا جائے گا جسے وہ طلب کریں گے لیکن اصحابِ جنّت کی طلب کسی کمی یا محرومی کا نتیجہ نہیں ہوگی بلکہ یہ طلبِ کمال ہوگی جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ پیغمبرؐ اور اُن کے ساتھیوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کے نور ان کے دائیں بائیں ہوں گے اور وہ جنّت میں اپنے نور کے اتمام کی تمنا کریں گے۔ اور اتمامِ نور کی منزل قربِ الٰہی کی منزل ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ جنّت میں سیئات دُور ہو چکے ہوں گے گویا ترقّی کی راہ کی رُکاوٹ ختم ہو جائے گی۔ اب اِنسان کے لئے ترقّی کا راستہ کھُل جائے گا۔ لیکن ترقّی کی کوئی حد نہیں ہے اس لئے اِنسان ہر لمحہ اپنے لئے کمالات میں ترقّی کی تمنا کرتے رہیں گے۔

سَلَامٌ قَوْلًا مِنْ رَبٍّ رَحِيمٍ ﴿۵۸﴾

"ربِّ رحیم کی طرف سے سلامتی کا پیغام ہوگا"

اصحابِ جنّت کی یہ کیفیت ہوگی کہ وہ تمام باطنی اور ظاہر آفات سے محفوظ ہونگے۔ سَلٰمٌ میں نکرہ کا صیغہ اس کی عظمت کے لئے وہ امن اور سلامتی اور اطمینان جو اللہ ہی جانتا ہے اور جو انسانی فہم سے بلند ہے۔ "یہ قول" ہے ربِ رحیم کا اور اس کا قول مستقل ہے۔ خواہ ثواب کا ہو یا عذاب کا۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حُسنیٰ میں سے "السّلام" بھی ہیں۔ اہلِ جنّت کے لئے قولِ سلام گویا اسی اسم مبارک کا پرتو ہے۔ یہ سلام اس سلام سے مختلف اور بلند ہے جو اللہ کے فرشتے مومنوں پر بھیجتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اصحابِ جنّت کی زندگی کی کیفیت یہ بتائی گئی ہے کہ یہ ہمیشہ قائم رہنے والی اور ہمیشہ ترقی کرنے والی زندگی ہے۔ اس زندگی میں مکمل خوشی اور راحت ہے، پاکیزہ ساتھی ہیں۔ یہاں انسان حق کے سائے میں راحت، عزت اور احترام کے ساتھ زندہ ہیں۔ ان کے نیک اعمال پھلوں کی صورت میں ان کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں ان کے سیئات دور ہو چکے ہیں اور وہ اپنے کمالات کی ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ وہ اپنے رب سے قرب کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ گویا یہ ایک ایسی زندگی ہے جس میں مکمل راحت، اطمینان، خوشی، طمانیت، سکون ہے جو ہر طرح کے خوف سے مامون ہے، اور جو ہمیشہ قائم رہنے والی اور ترقی کرنے والی زندگی ہے۔ وہ اپنے آپ سے، اپنی کیفیت سے، اپنے خدا سے اس اطمینان کی حالت میں ہیں جو تصور سے باہر ہے۔

جنّت میں جانے کے کون سزاوار ہیں؟ اس کے متعلق تیسرے رکوع میں واضح اشارے ہیں۔ اس رکوع میں اللہ تعالیٰ کی آیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ
(۱) ان آیات کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ان پر غور کر کے اس حقیقت کا عرفان حاصل کرے جس کی طرف یہ آیات اشارہ کرتی ہیں۔ اپنے ماضی اور مستقبل سے غافل نہ رہنا "اتقوا مابین ایدیکم وما خلفکم" اپنے نفس، اپنے ماحول، تاریخ اور فطرت پر غور کرنا بھی تقویٰ کی کیفیت ہے۔ تقویٰ کی روح وہ آگاہی اور بیداری ہے جو

انسان کو کسی لحظ حقیقت کی طرف سے غافل نہیں ہونے دیتی۔ رات کے خطرات سے بچ کر چلتے ہیں۔ ② اور جب اللہ کی آیات میں سے کسی آیت کو پاتے ہیں تو اس کی طرف پیٹھ نہیں کرتے بلکہ خدائی اشاروں کی پیروی کرتے ہیں ③ معاشرہ کی زندگی میں جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اس کو اللہ کی عطا سمجھتے ہیں اور اللہ کی مخلوق کا اس میں حق سمجھتے ہیں انفاق مال کرتے ہیں، اطعام مسکین کی ترغیب دیتے ہیں اور ④ اپنے آپ کو مسئول اور ذمہ دار اپنے ہر فعل وعمل میں سمجھتے ہیں، قیامت میں یقین رکھتے ہیں اور ہر لحظہ اپنا احتساب کرتے رہتے ہیں۔

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾

(اور اے مجرمو) آج کے دن الگ ہو جاؤ۔ اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا کہ وہ یقیناً تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے! اور صرف میری ہی عبادت کرنا کہ یہی سیدھا راستہ ہے)۔

ان آیات میں اصحاب جہنّم کا ذکر کیا گیا ہے۔ قیامت میں کیفیت یہ ہوگی کہ مجرم علیحدہ کر دیے جائیں گے اللہ پوچھتا ہے کہ بنی آدم کیا تم سے یہ عہد نہیں لیا گیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کروگے کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے بلکہ تم میری عبادت کروگے کہ یہی صراطِ مستقیم ہے۔

ان آیتوں میں اصحابِ جہنّم کی صفات بیان کی گئی ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ سے اپنے عہد کو توڑ دیا اور صراطِ مستقیم کی بجائے شیطان کی پرستش کا راستہ اختیار کیا۔ اس طرح ان پر حجت تمام ہوگئی اور وہ جہنّم کے مستحق ٹھہرے۔ یہ اصحاب جہنّم کی خصوصیات ہوئیں۔ مگر ان کی کیفیت بیان نہیں کی گئی۔ اصحاب جنّت کے ذکر

میں ان کی کیفیات بیان کی گئی تھیں خصوصیات کا ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ اب اصحاب جہنم کے ذکر میں خصوصیات بیان کر دی گئی ہیں مگر جہنم کی زندگی کا نقشہ نہیں کھینچا گیا۔ لیکن اس سیاق میں ان کی سزا اسی تمثیل میں آگئی جو اس سورہ کے پہلے رکوع میں دی گئی ہے۔ یہ ایسے انسانوں کی تصویریں ہیں جو سینہ سے ٹھوری تک زنجیروں میں کسے ہوئے ہیں جن کی ٹھوریاں اوپر کو اٹھی ہوئی ہیں جو ان کے تکبر کی نشانی ہے، جن کے آگے بھی دیوار ہے اور پیچھے بھی دیوار ہے جن کے سر پر بھی چھت سی پٹی ہوئی ہے۔ یہ ان غافل لوگوں کی حالت بیان کی گئی ہے جو تکبر اور سرکشی کا شکار ہیں جو اپنی انا کے حصار میں قید ہیں۔ جن کا دوسروں سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ تصویریں ان انسانوں کی اصلی حالت کی نقشہ کشی کرتی ہیں۔ دنیا میں اس حالت پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ قیامت میں یہ پردہ اٹھ جائے گا۔ گویا اصحاب جہنم کی وہ کیفیت ہوگی جو ان تصویروں میں پیش کی گئی ہے۔ اور جیسے جیسے ہم زیر مطالعہ آیات پر غور کریں گے یہ تصویریں واضح اور نمایاں ہوتی جائیں گی۔

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ کہہ کر گناہ گاروں کو علیحدہ ہونے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اگرچہ کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں مسلم اور مجرم ہمیشہ علیحدہ رہتے ہیں لیکن دنیا میں بظاہر مجرم اور مسلم مخلوط ہیں۔ اب قیامت میں انہیں الگ ہونے کا حکم دیا جا رہا ہے حقیقت میں قیامت تو ہے ہی یہ اس کے علاوہ ہر مجرم الگ الگ اپنے اپنے عذاب میں گرفتار ہوگا اور ہر مجرم یہ سمجھے گا کہ اس کا عذاب اور سب سے زیادہ ہے۔ مجرموں کی یہ کیفیت اس لئے ہوگی کہ وہ اس دنیا میں بھی اپنی انا کے حصار میں محصور تھے، ان کا دوسرے انسانوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نہ وہ انفاقِ مال کرتے تھے۔ نہ مسکین کو کھانا کھلاتے تھے۔ اب قیامت میں وہ تنہا اپنے عذاب میں گرفتار ہیں۔ نہ ان کا کوئی ساتھی ہے اور نہ مددگار۔ یہ گنہ گار انسانوں کی وہی

تصویر ہے جو پہلے رکوع میں پیش کی گئی ہے۔

بنی آدمؑ سے اللہ کا عہد

اصحابِ جہنم کو مجرم اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے عہد کو توڑنے کے جُرم کا ارتکاب کرنے والے ہیں۔ یہ عہد یعنی شیطان کی عبادت نہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا عہد کئی سطحوں پر کیا گیا ہے۔ پہلی سطح وہ ہے جہاں انسان کا بحیثیت مخلوق اپنے خالق سے عہد ہے' اسی لئے اللہ تعالیٰ اس عہد کو توڑنے والوں کو بنی آدمؑ کہہ کر خطاب کر رہا ہے۔ کلام پاک میں متعدد مقامات پر حضرت آدمؑ اور ابلیس کا قصہ بیان کیا گیا ہے' جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدمؑ کو سجدہ کریں تو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا ان کے مقابلے میں اپنی برتری کا اظہار کیا۔ بنی آدمؑ کی کمزوری اور پستی کا یہ کہہ کر اظہار کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے مہلت عطا کر دے تو وہ سوائے چند کے تمام اولادِ آدمؑ کو گمراہ کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو وقتِ معلوم تک مہلت عطا کر دی مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ جو میرے مخلص بندے ہیں ان پر تجھے کوئی سلطان یا تسلط حاصل نہیں ہو سکے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ سے بنی آدمؑ کا پہلا عہد تھا جو روزِ ازل سے شروع ہوا۔ دوسری سطح اس عہد کی تجدید اور توثیق کی رسولوں کے ذریعے کی جاتی رہی۔ انسانوں کو بار بار یہ تنبیہ کی جاتی رہی کہ وہ شیطان کے بہلانے میں نہ آئیں اس لئے کہ وہ ان کا کھلا ہوا دشمن ہے لیکن مجرم رسولوں کی دعوت کا انکار کر کے اللہ سے اپنے عہد توڑتے رہے۔ بنی آدم سے اس عہد کی ایک اور سطح وہ ہے جب عالم ذر میں اللہ تعالیٰ نے ذریتِ آدمؑ سے سوال کیا الست بربکم تو سب نے کہا "بلیٰ" "بے شک تو ہمارا رب ہے۔" عالم ذر کا یہ عہد کسی خاص وقت تک محدود نہیں تھا بلکہ درحقیقت یہ انسانی

فطرت سے اللہ تعالیٰ کا وہ خطاب ہے جو مسلسل جاری ہے، یہ عہد ہر لحظہ دُہرایا جا رہا ہے۔ اِنسان کی فطرتِ صحیحہ ہر لحظہ اس عہد کی توثیق کر رہی ہے۔ مجرمین اس عہد کو جو ان کی فطرت میں نقش ہے جو روزِ ازل سے آج تک مسلسل دہرایا جا رہا ہے اور جس کی تجدید و تاکید پیغمبروں کے ذریعے کی جاتی رہی ہے توڑنے کے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ شیطان کی عبادت کرتے ہیں حالانکہ شیطان ان کا کُھلا ہوا دشمن ہے۔

یہاں اس حقیقت کو پوری وضاحت اور اہمیت کے ساتھ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ شیطان اللہ تعالیٰ کا حریف یا دشمن نہیں ہے بلکہ شیطان آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کا دشمن ہے۔ اسلام نور اور ظلمت اور یزداں اور اہرمن کی ثنویت کا قائل نہیں ہے بلکہ ظلمات اور نور کا خالق وہی ایک اللہ ہے، اس نے شیطان کو ایک خاص مصلحت سے خلق فرمایا ہے کہ اسی طرح اِنسان کا امتحان ممکن ہے۔

اس موقع پر بنی آدمؑ کہہ کر خطاب کرنے کی مصلحت کا ایک اور رُخ بھی ہے جو اِنسان کی اس فطرت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو لغزش کے بعد توبہ کرنے سے عبارت ہے۔ آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کے لئے لغزش سے بچنا ممکن نہیں ہے، اِنسان کی فطرت ہے کہ وہ شیطان کے بہکانے سے گمراہ ہو جاتا ہے سوائے ان لوگوں کے جنھیں اللہ نے اپنی پناہ میں لے لیا ہو یعنی جو مقامِ عصمت پر فائز ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اِنسان کی اس کمزوری کو دیکھتے ہوئے اس کے لئے توبہ کا دروازہ کُھلا رکھا ہے۔ اور قصۂ آدم کے حوالے سے بنی آدمؑ کو جس راستے کی تعلیم دی گئی ہے وہ یہ کہ اگرچہ لغزشِ انسانی فطرت کی کمزوری ہے لیکن لغزش پر اصرار کرنا انسانی فطرت کا تقاضہ نہیں ہے۔ بلکہ فطرتِ صحیحہ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان لغزش کا احساس کر کے توبہ کرے اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور ہدایت کے دروازے اس پر کھول دیتا ہے۔ مجرمین وہ ہیں جو اپنے گناہوں پر اصرار کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے

فرمان کی خلاف ورزی کے ساتھ ساتھ اپنی فطرت سے بھی انحراف کرتے ہیں۔ وہ شیطان کے وسوسوں اور دھوکوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ شیطان کی اطاعت انکی زندگی کا شعار بن جاتی ہے اور یہی وہ کیفیت ہے جسے شیطان کی عبادت کہا گیا ہے، اور شیطان کی عبادت مجرمین کو جہنم کا مستحق بنا دیتی ہے۔

وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ۭ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾

"اور تم میں سے کتنی کثیر تعداد لوگوں کو اس نے گمراہ کر دیا۔ کیا پھر بھی تم عقل سے کام نہ لو گے"؛

اصحاب جہنم وہ ہیں جنھوں نے اللہ کی عبادت کا راستہ ترک کر کے شیطان کی اطاعت کی۔ شیطان انسان کو طرح طرح سے دھوکہ دیتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کا اہتمام کیا اور اس ہدایت کو قبول کرنے کے لئے عقل کی صلاحیت دی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ مجرمین پر اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ کہہ کر "عقل" ہی کے حوالے سے اپنی حجت تمام کر رہا ہے کہ اگر تم عقل سے کام لیتے، اگر تم اپنے نفس، اپنی تاریخ اور اپنے ماحول پر غور و فکر کرتے تو تمہیں معلوم ہو جاتا کہ شیطان کے حربے کیا ہیں۔ اس نے کس طرح بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ انسان جب دیکھتا ہے کہ بدکار اور ظالم دنیاوی پیمانے کے لحاظ سے کامیاب ہیں تو اس کا دل وسوسوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ لوگ فرعون کی طاقت اور قارون کی دولت سے متاثر ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ کہیں یہی راستہ تو کامیابی کا راستہ نہیں ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کی آنکھ دھوکہ کھا سکتی ہے لیکن اس کی عقل دھوکہ نہیں کھا سکتی اور انسان اگر تعقل کرے تو وہ صحیح اور غلط راستہ میں تمیز کر سکتا ہے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾

"یہی ہے وہ جہنم جس سے تمہیں ڈرایا گیا تھا' آج اس میں جل جاؤ اس کفر (انکار) کی وجہ سے جو تم کیا کرتے تھے۔"

یہ خطاب ان لوگوں سے کیا جارہا ہے جو شیطان کے وعدوں پر اعتبار کرتے ہیں۔ انسان سے کچھ وعدے شیطان کرتا ہے اور کچھ وعدے اللہ تعالیٰ نے کئے ہیں۔ جو شیطان کے وعدوں پر اعتبار کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے اپنے اس عہد کو توڑتے ہیں جو ان کی فطرت کا حصہ ہے' جو رسولوں کی مخالفت کرتے ہیں' جو گناہوں پر اصرار کرتے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ یہ وہ مجرم ہیں جنہوں نے شیطان کی عبادت کی اور اس کے عوض شیطان نے ان سے جو وعدے کئے تھے وہ محض دھوکہ اور فریب ثابت ہوئے' اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے ایسے مجرموں سے جہنم کا وعدہ کیا تھا۔ انھوں نے اپنے کفر کے ذریعے خود کو جہنم کا مستحق بنالیا اس لئے ان سے کہا جارہا ہے کہ یہ وہ جہنم ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اور چونکہ تم کفر کرتے رہے ہو اس لئے اس میں داخل ہوجاؤ اور اس سے ہمیشہ کے لئے چمٹ جاؤ۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٦٥﴾

"آج ہم ان کے منہ پر مہریں لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے اس پر جو وہ کماتے تھے۔"

یہ وہ دن ہوگا کہ جب ان کے منہ پر مہر لگادی جائے گی اور ان کے ہاتھ اور پاؤں اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ کلام پاک میں متعدد مقامات پر گواہی کا ذکر آیا ہے' ایک موقع پر کہا گیا ہے کہ بے شک سمع' بصر اور افئدہ سب کے سب مسئول ہیں ایک اور موقع پر ان کے علاوہ جلود کی گواہی کا ذکر کیا گیا ہے اور اب اس مقام پر ہاتھ اور پاؤں کی گواہی کا ذکر ہے۔ گویا قیامت میں جو چیزیں انسان

کے خلاف گواہی دیں گی وہ یہ ہیں: سمع، بصر، افئدہ، جلود، ہاتھ اور پاؤں۔

سمع، بصر اور افئدہ علم حاصل کرنے کے ذرائع ہیں، سمع کا تعلق علم تاریخ سے ہے، بصر کا تعلق علم فطرت سے ہے اور افئدہ وہ صلاحیت ہے جس کے ذریعے علم کو حکمت میں ڈھالا جاتا ہے۔ سمع، بصر اور افئدہ وہ کھڑکیاں ہیں جن کے ذریعے انسان اور کائنات کے درمیان رابطہ قائم ہے، انہی ذریعے انسان اپنے نفس، اپنے ماحول اور اپنی تاریخ کا علم حاصل کرتا ہے۔ سمع سے سوال کیا جائے گا کہ اس نے کیا سُنا حق کا پیغام یا شیطان کا جھوٹ، بصر سے پوچھا جائے گا کہ اس نے کیا دیکھا، حقیقت کا مشاہدہ کیا یا فریب سحر میں گرفتار رہا اور افئدہ سے یہ سوال کیا جائے گا کہ اس نے ماضی اور حال پر غور و فکر کرکے کیا نتیجہ نکالا۔ سمع، بصر اور افئدہ کا تعلّق باطنی کیفیت سے ہے۔ جلد جو کچھ باطن ہے اس کا ظاہر ہے اور باطن کے اثرات اس پر وارد ہوتے ہیں۔ اس لئے جلد گواہی دے گی کہ انسان کے باطن میں کونسی آرزوئیں اور تمنائیں خواہشات اور شہوات چھپی ہوئی تھیں۔ گواہی کا تیسرا درجہ ہاتھ اور پاؤں کی گواہی کا ہے۔ ہاتھ کا تعلّق معاملات سے ہے یہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ انسان نے دوسروں کے ساتھ کیسا عمل رکھا اور پاؤں اس بات کی گوائی دیں گے کہ وہ کس راستے پر چلا اور کون سے مقام تک پہنچا۔

قیامت میں کیفیت یہ ہوگی کہ منہ پر مہر لگا دی جائے گی۔ زبان چپ رہے گی کیا اس لئے کہ یہ دُنیا میں بہت جھوٹ بول چکی ہے اور اس کا اعتبار ختم ہو چکا ہے اور اس لئے آج گواہی سے ساقط کر دیا گیا ہے؟ آج گواہی کے لئے باطنی گواہ لائے جا رہے ہیں۔ سمع، بصر اور افئدہ باطنی گواہ ہیں۔ جلد باطنی کیفیت کو ظاہر کرنے والی چیز ہے اور ہاتھ پاؤں دُنیاوی زندگی کے عوامل ہیں۔ آج یہ سب انسان کے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔ گویا انسان کا نفس اس کی حقیقت (ESSENTIAL SELF) ان عوامل سے جُدا ہے جن پر تصرف کا وہ دعویٰ کرتا ہے انسان جن چیزوں کو اپنی ملکیت

کچھ رہا تھا یعنی اس کے ہاتھ پاؤں، جلد، سمع، بصر اور افئدہ وہ سب اس سے بیگانہ ہو گئے ہیں اس کے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔ یہ گویا اس حقیقت کا اثبات ہے کہ یہ تمام چیزیں انسان کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی وہ معیت کردہ امانت ہیں جنہیں خاص مقاصد کے تحت عطا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر جاسوس ہیں آج یہ سب چیزیں اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ انہیں انسان نے کس طرح استعمال کیا۔ ان کو صحیح مقاصد کے لئے استعمال کیا یا ان سے غلط کام لئے۔

وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا عَلَىٰ أَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَأَنَّىٰ يُبْصِرُونَ ﴿٦٦﴾ وَلَوْ نَشَاءُ لَمَسَخْنَاهُمْ عَلَىٰ مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوا مُضِيًّا وَلَا يَرْجِعُونَ ﴿٦٧﴾

"اور اگر ہم چاہتے تو ان کی آنکھوں کو بے نور کر دیتے اور وہ راستہ ٹٹولتے پھرتے۔ مگر دیکھیں تو کس طرح سے؟"

(اور اگر ہم چاہتے تو جہاں کہیں بھی وہ تھے انہیں اسی مقام پر مسخ کر دیتے پھر نہ تو ان میں آگے جانے پر قابو رہتا اور نہ لوٹ جانے پر)۔

(اصحاب جہنم کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ) اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھوں کو مٹا دیں پھر اگر وہ راستے پر سبقت کی کوشش بھی کریں تو وہ دیکھیں کس طرح اور اگر ہم چاہیں تو انہیں ان کی جگہوں پر مسخ کر دیں کہ پھر وہ نہ آگے بڑھ سکیں اور نہ پیچھے لوٹ سکیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کو بصارت اور بصیرت عطا کی، اسے ظاہری اور باطنی حواس دیئے اور اگر غلط راستے پر جا نکلے یا غلط جگہ پر مقیم ہو تو رجوع بھی کر سکتا ہے، لوٹ بھی سکتا یہ حواس اور قویٰ عقل اور بصیرت (باطنی حواس اور قویٰ) کے آلہ کار ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو قویٰ عطا کئے۔ حرکت کی استطاعت دی وہ آگے بڑھ سکتا ہے اور ان میں

سے ایسے بھی ہیں جو تیری بات سنتے ہیں پس کیا تو بہروں کو سنائے گا حالانکہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جو تیری طرف دیکھتے ہیں بس کیا تو اندھوں کو راستہ دکھائے گا وہ بصیرت سے محروم ہیں"۔

(۲) انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے حواس اور قویٰ کو صحیح طور پر استعمال کرے۔ آنکھیں دی ہیں تو صحیح راستہ دیکھے، گمراہی کے راستے سے صحیح راستہ کو تمیز کرے اور سیدھے راستہ پر سبقت کرے جس مقام اور جس حالت میں ہے اسے بہتر بنانے کی سعی کرے کہ حرکت کی استطاعت کا تقاضا ہے اور اگر اس کا کوئی قدم غلط راستہ پر اٹھ گیا ہے تو توبہ کر کے صحیح راستے کی طرف رجوع کرے۔ اس نے ہمیں بصارت، بصیرت، عقل، شعور، حرکت، آگے بڑھنے کی سعی، رجوع اور توبہ کی سب صلاحیتیں دی ہیں۔

(۳) اس نے آنکھیں دی ہیں تو راستہ دیکھ کر اس پر سبقت کرو ورنہ تو اللہ تعالیٰ میں یہ قدرت ہے کہ وہ آنکھوں کو اس طرح مٹا دے کہ ان کا کوئی نشان بھی باقی نہ رہے (طمس: محو کرنا کہ نشان بھی نہ رہے) اور پھر انسان کی حالت اس اندھے کی سی ہو جائے جو باوجود کوشش کے قدم آگے نہیں بڑھا سکتا۔ اگر اس نے حرکت کی استطاعت دی ہے تو بہتر حالت کی طرف بڑھنے کی سعی کرو اور گمراہی سے رجوع کرو ورنہ اللہ تعالیٰ میں قدرت ہے کہ وہ قویٰ کو اس طرح مفلوج کر دے کہ انسان نہ آگے جا سکے نہ پیچھے ہٹ سکے بلکہ انسان جس مقام پر ہے اسی مقام پر اس کو جامد کر کے اس کی اچھی صورت سے بری صورت کی طرف قلبِ ماہیت کر دے (اللہ تعالیٰ تو انسان کو بندر اور سور میں بھی تبدیل کر سکتا ہے اور کرتا ہے) پھر اگر انسان اس حالت سے نکلنا بھی چاہے (جو خود بہت مشکل ہے) تو نہیں نکل سکتا اور اپنی پہلی حالت کی طرف رجوع کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔

(۴) یہ بات کہ انسان کی آنکھیں محو کی جا سکتی ہیں اور اس کی طاقت اور حرکت سلب کی جا سکتی ہے خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے حواس و قویٰ اس کی ملک نہیں

ہیں بلکہ امانت ہیں جس کے لئے وہ جوابدہ ہے۔

(۵) مجرمین کی حالت یہ ہے کہ انہیں جو حواس اور قویٰ دیئے گئے تھے انہوں نے ان صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ انہوں نے ناشکری کی۔ کفر کا ارتکاب کیا جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب اور سمع پر مہریں لگا دیں اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے اب ان کی حالت اس اندھے اور مفلوج اور مسخ شدہ شخص کی سی ہے جسے نہ کچھ سجھائی دیتا ہے اور نہ وہ حرکت کر سکتا ہے۔ جب ان کی گردنوں میں طوق پڑے ہیں ٹھوڑیوں تک اور منہ اُوپر کو اٹھے ہوئے ہوں تو وہ اپنے آگے کیسے دیکھ سکتے ہیں اور جب آگے پیچھے دیواریں کھڑی ہیں اور سر پر چھت ڈھکی ہوئی ہے تو وہ آگے پیچھے حرکت کس طرح کر سکتے ہیں۔

تو پھر یہ راستہ دیکھ کر آگے کی طرف سبقت کرنا چاہیں تو ان میں بصارت کہاں اور اگر مسخ شدہ جامد حالت سے نکلنا چاہیں اور پہلی حالت کی طرف لوٹنا چاہیں تو استطاعت کہاں۔

—:o:(✻):o:—

پانچواں رکوع

سورۂ یٰسین کا پانچواں رکوع، آخری رکوع ہونے کے اعتبار سے اس سورت کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ہے۔ مضامین کے اعتبار سے اس سورت کی تشکیل (MORPHOLOGY) کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ پہلے رکوع میں آتا اور درمیان میں اس کے مختلف پہلو واضح کیے جاتے ہیں اور آخری رکوع میں پھر اسی طرف رجوع کیا گیا ہے جہاں سے بات شروع ہوئی تھی اور اس طرح مضامین کو وسعت اور ترقی دے کر ایک نسبتاً بلند سطح پر بیان کیا گیا ہے۔ پانچویں رکوع کے مطالعہ سے اس سورۂ مبارکہ میں بیان کیے گئے تمام مضامین کی ایک مکمل، جامع اور روشن تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کی ابتداء رسول اور کتاب کے ذکر سے ہوتی ہے اور اس کا اختتام اس آیت پر ہوتا ہے کہ فسبحان الذی بیدہٖ ملکوت کل شیئٍ والیہ ترجعون۔ گویا اس سورت کی ابتداء میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی ہدایت کا انتظام کیا ہے۔ ہدایت کے سرچشمہ دو ہیں یعنی رسول اور کتاب اور یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رُخ، ایک دوسرے کے گواہ اور ایک دوسرے کی تصدیق اور تکمیل کرنے والے ہیں۔ کتاب رسولؐ کی تصویر ہے اور رسولؐ کتاب کی تفسیر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی شان یہ ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کی طرف کوئی نذیر نہ بھیجا گیا ہو۔ اس سورہ میں خاص طور پر حضورؐ کی رسالت کا ذکر ہے، جنہیں ایک ایسی قوم پر مبعوث کیا گیا جو ابھی ملت نہیں بنی اور جس کو ابھی کتاب عطا نہیں کی گئی۔ ملت کی تاسیس رسولؐ کے ذریعے ہوتی ہے، رسولؐ ملت کا مؤسس ہوتا ہے اور کتاب ملت کے پاس امانت ہوتی

ہے۔ حضورؐ کی رسالت کے ذریعہ عرب میں ایک ملّت کی تاسیس عمل میں آئی۔ اس ملّت کی بنیاد نسل یا وطن پر نہیں رکھی گئی بلکہ انسان بحیثیت انسان پر یعنی اس فطرت پر جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے، رکھی گئی اور اس لئے آپ کے ہاتھوں جس ملّت کی تاسیس عمل میں آئی وہ زمانی اور مکانی دونوں جہتوں سے ایک عالمگیر ملّت ہے۔

اس سورت کی ابتدا ہدایت کے ذکر سے ہوتی ہے۔ ہدایت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت کا اہتمام کرتا ہے کسی شخص (PERSON) کے ذریعہ اور کسی کتاب (BOOK) کے ذریعے جو اس پر نازل ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ جب کوئی رسول ہدایت کی دعوت دیتا ہے تو انسانوں کا ردِّ عمل کیا ہوتا ہے۔ یہ ردِّ عمل دو صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ہدایت کو قبول کرتے ہیں اور وہ لوگ جو رسولوں کی دعوت کو قبول کرتے ہیں ان کی دو خصوصیات ہیں ایک اتباعِ ذکر اور دوسری خشی الرحمٰن بالغیب یعنی حقیقت کو معلوم کرنے کی تڑپ اور زندگی کے لئے صحیح راستے کی تلاش ان کے لئے مغفرت اور اجرِ کریم کی بشارت ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ رسولوں کی دعوت کا انکار کرتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ غفلت اور تکبّر کا شکار وہ ہر حرکت اور بصیرت سے محروم اپنی انا کے خول میں بند ہیں۔

رسول کا کام انذار یعنی ڈرانا ہے۔ ہدایت کو قبول کرنا یا نہ کرنا ہر شخص کی اپنی ذمّہ داری ہے۔ انذار کے معنی ڈرانے کے ہیں لیکن اس میں خوف زدہ (FRIGHTEN) کرنے کی کیفیت نہیں ہوتی بلکہ یہ ڈرانا تنبیہ کرنے (WARNING) کے معنوں میں آتا ہے۔ رسول لوگوں کو زندگی کے راستے سے اس طرح نہیں ڈراتا کہ وہ خوف زدہ ہو کر سفر ترک کر دیں بلکہ وہ راستے کے خطرات سے متنبہ کرتا ہے تاکہ مسافران خطرات سے بچ کر صحیح سلامت منزل تک پہنچ سکے۔ رسولوں کی سنّت یہ ہوتی ہے کہ وہ صراطِ مستقیم کی نشاندہی کر دیتے ہیں اور پھر لوگ اس بات کے لئے آزاد ہوتے ہیں کہ وہ اپنے لئے جو راستہ چاہیں اختیار کریں۔ رسول صحیح راستے کو غلط راستے سے الگ کر کے دکھا دیتا ہے اور ان دونوں راستوں پر چلنے کا انجام بھی

بتا دیتا ہے اور وہ انجام آخرت کی زندگی میں ظاہر ہو جاتا ہے جو دنیاوی زندگی کا ہی تسلسل اور اس کا نتیجہ ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس رکوع میں جن مضامین کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔ ہدایت اور اس کے دو سرچشمے یعنی رسول اور کتاب، قوموں کی ہدایت کے لئے رسولوں کی بعثت، رسولوں کی دعوت کی طرف انسانوں کے دو رد عمل یعنی اس دعوت کا اقرار یا انکار۔ دعوت رسالت کا اقرار یا انکار کرنے والوں کی خصوصیات اور اس اقرار یا انکار کا انجام جو آخرت کی زندگی میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مضامین ہیں جنہیں اس سورے کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے رکوع میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اور پھر پانچویں رکوع میں نسبتاً مختلف سطح پر بات انہی مضامین کی طرف رجوع کرتی ہے۔

دوسرے رکوع میں ہدایت کے ردّ و قبول کو ایک تمثیل کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ اس نے ہر قوم کی طرف ڈرانے والوں کو بھیجا ہے اور یہ بھی اس کی سنت ہے کہ کوئی قریہ تباہ نہیں کیا جاتا جب تک اللہ تعالیٰ رسولوں کے ذریعہ اپنی حجت تمام نہیں کر دیتا۔ جب کوئی قوم تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتی ہے تو اس کی زندگی کا راستہ ایسا ہو جاتا ہے کہ لوگ ہدایت کرنے والے کی بات نہیں سنتے بلکہ اس کا انکار اور استہزاء کرتے ہیں۔ سورۂ یٰسین کے دوسرے رکوع میں ایسے ہی ایک قریے کی تمثیل پیش کی گئی ہے جس کے لوگوں نے رسولوں کا انکار کر کے خود پر عذاب الٰہی کو متحقق کر لیا۔ اس تمثیل کے ذریعے ان اسباب، محرکات اور ترغیبات کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی وجہ سے ہدایت کا انکار یا استہزاء کیا جاتا ہے۔ ان اسباب میں ایک سبب تکبر ہے۔ لوگ رسولوں کے مقابلے میں تکبر کرتے ہیں۔ رسولوں کا انکار کرتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ ایک بظاہر ان جیسا آدمی اللہ کا رسول بھی ہو سکتا ہے۔ ان کا تکبر انہیں حق کو قبول کرنے سے باز رکھتا ہے۔ (۲) پھر اس قوم کے صاحبانِ اقتدار جن کی علامتیں فرعون، ہامان اور قارون ہیں، اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ رسولوں کی دعوت کو قبول

نہ کیا جائے اس لئے کہ اس سے معاشرہ میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے اور ان کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے اور معاشرہ میں انہیں عزت، طاقت اور دولت کے لحاظ سے جو برتر مقام حاصل ہے وہ مجروح ہوتا ہے (۳) پھر عام لوگ ہیں جو معاشرے کی مروجہ روش اور نہج کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اسی سے چمٹے رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہر قوم میں ابتداً بہت کم سلیم الطبع لوگ ایسے ہوتے ہیں جو رسول کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور چونکہ اکثر ان کا تعلق معاشرے کے کم زور اور محروم طبقہ سے ہوتا ہے اس لئے دوسرے لوگ انہیں حقارت سے سفیہ کہتے ہیں مگر یہی لوگ نئی ملت کا انقلابی مرکز بناتے ہیں۔ اس رکوع میں پیش کردہ تمثیل کے ذریعے ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ جب قومیں غفلت، تکبر اور جہالت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جب ان کی زندگی کی روش اس طرح مسخ ہو جاتی ہے کہ وہ ہدایت کا انکار کرتے ہیں اور رسولوں کا مذاق اُڑاتے ہیں تو پھر ان پر حجت الٰہی تمام ہو جاتی ہے اور وہ ہلاکت کا شکار ہو جاتی ہیں البتہ اگر ایک بھی شخص خود کو اس قوم سے الگ کر کے ہدایت کو قبول کرتا ہے تو وہ مغفرت اور اجرِ کریم کا سزاوار قرار پاتا ہے۔ اس تمثیل میں قوموں کی زندگی اور موت کے اصول کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ملت کی تاسیس رسولؐ کے ذریعے ہوتی ہے، ملت کی زندگی کا انحصار رسول اور کتاب سے تمسک پر ہے اور ملت کا زوال اور رسولؐ کے انکار کا نتیجہ ہے۔

تیسرے اور چوتھے رکوع میں زندگی کی مختلف حالتیں اور کیفیتیں بیان کی گئی ہیں۔ انسانی زندگی کے مستقر دو ہیں یعنی دنیا اور آخرت اور دُنیا اور آخرت کی زندگی میں ایسا گہرا اور ناگزیر ربط ہے کہ ایک کے معنی دوسرے کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتے۔ قیامت کی زندگی دُنیاوی زندگی کا لازمی نتیجہ بھی ہے اور لازمی تقاضا بھی ہے اور حیات دُنیا میں معنی پیدا کرنے والی ہے۔ حیاتِ آخرت کے بغیر حیاتِ دُنیا کے معنی، مقصد، منزل اور سمت معین نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ حیاتِ آخرت اور حیاتِ دُنیا، حیات ہی کے دو

مقام اور پہلو ہیں۔

تیسرے اور چوتھے رکوع میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں رسول اور کتاب کا ذکر نہیں ہے بلکہ اب خطاب براہِ راست اللہ اور بندے کے درمیان ہے۔ رسول کا کام بندے کو اللہ کی طرف متوجہ کرنا ہے اب جبکہ یہ کام ہو چکا اور بندے اللہ کے روبرو ہو چکے تو اب اللہ اور بندے کا تعلق اُجاگر کیا جا رہا ہے، اب انسان کی استعداد کو جو ہدایت قبول کرنے سے تعلق رکھتی ہے یعنی عقل و بصیرت کو مخاطب کیا جا رہا ہے۔ دوسرے رکوع کے اختتام پر ایک حسرت آمیز لہجہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ انسانوں کی حالت یہ ہے کہ جب کوئی رسول انہیں راہِ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے تو وہ اس کا استہزاء کرتے ہیں۔ تیسرے رکوع کے اختتام پر یہ کہا گیا ہے کہ انسانوں کی حالت یہ ہے کہ جب کوئی اللہ کی آیت پیش کی جاتی ہے تو وہ تو وہ اس کی طرف پیٹھ کر لیتے ہیں یعنی اس پر تعقّل اور تدبّر نہیں کرتے تاکہ ہدایت حاصل کر سکیں۔

تیسرے اور چوتھے رکوع کی آیات میں حیاتِ دُنیا اور حیاتِ عقبیٰ کی تصویر کشی کی گئی ہے نیست کو ہست میں بدل دینا اور موت میں سے زندگی برآمد کرنا اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ موت میں سے زندگی برآمد کرنے کی تمثیل مُردہ زمین کے زندہ ہونے کی تمثیل ہے۔ مُردہ زمین بارش کے ذریعہ زندہ ہو جاتی ہے۔ بارش اللہ کی رحمت ہے۔ انسان کو نیست سے ہست میں لانا بھی اللہ کا فضل ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ذریعے موت میں سے زندگی کو برآمد کرتا ہے۔ پھر وہی ہے کہ جس نے زندگی کے لئے وسائل مُہیا کئے۔ زمین سے اناج، سبزیاں اور پھل برآمد کئے، نہریں اور چشمے جاری کئے اور خود انسان کو اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی صلاحیت عطا کی، زندگی کی تخلیق اور زندگی کے قیام کے وسائل کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے زندگی کی بقا اور تسلسل کا اس طرح اہتمام فرمایا کہ اس نے تمام مخلوقات کو زوج زوج خلق کیا اور پھر اس نے زندگی کے لئے ایسا ماحول بنایا ہے جو منظم اور حسین ہے، جہاں ہر چیز ایک قاعدے اور قانون کے تحت ہے، ہر شے مسخر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان پر مزید یہ رحمت کی اس کے لئے خشکی کے علاوہ

سمندر میں بھی سفر کو ممکن بنا دیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایسی دُنیا میں جو اس قدر منظم اور حسین ہے جو اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت، اس کی قدرت اور حکمت کی مظہر ہے جہاں انسان کو طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا گیا ہے انسان کے لیئے زندہ رہنے کا طریقہ کیا ہے یہ دُنیا اور اس کا ماحول انسان سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے گردو پیش اور اپنے ماضی اور مستقبل کی طرف سے غافل نہ رہے بلکہ آیاتِ الٰہی پر تفکر و تدبر کے ذریعے تقویٰ اختیار کرے کہ اس کی فلاح کا یہی راستہ ہے۔ وہ اس حقیقت کا شعور اور آگاہی حاصل کرے کہ اس دُنیا میں جہاں ہر چیز ایک مقررہ نظام کے تحت چل رہی ہے انسانی زندگی کے لیئے بھی ایک نہج اور ایک راستہ مقرر کیا گیا ہے اور اسی ہدایت کی روشنی میں انسان اپنے نفس، اپنے ماحول اور اپنی تاریخ میں موجود آیات پر غور کر کے اپنی زندگی کے لیئے صحیح راستہ کو دریافت کر سکتا ہے' اور پھر انسان یہ حقیقت دریافت کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے جن لاتعداد نعمتوں سے نوازا ہے تو ان کے لیئے اللہ کا شکر ادا کرنے اور ان نعمتوں میں برکت اور ازدیاد کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو دوسروں کی خدمت میں صرف کرے۔ انفاقِ مال اور اطعامِ مسکین کی روش کو اپنائے۔ اس لیئے کہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔

وہ لوگ جو غفلت کا شکار ہیں وہ اپنی انا کے خول میں محصور رہتے ہیں وہ دوسرے انسانوں کا اپنے اوپر کوئی حق نہیں سمجھتے بلکہ ان کا استحصال کرتے ہیں۔ اسکے برعکس وہ لوگ جو آگاہ اور بیدار ہیں وہ اپنے مال میں سائل اور محروم کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ یہ دو معاشرتی زندگی گزارنے کے دو متضاد طریقے ہیں۔ بہرحال جو طریقہ زندگی انسان اختیار کرے زندگی کا یہ باب ختم تو ہوگا اور انسان اپنے اس مستقر دارِ فانی سے دوسرے مستقر دارِ عاقبت کو منتقل تو ہوگا۔

یہ دُنیا دار العمل ہے' آخرت دار الجزاء ہے۔ اس دُنیا میں حق اور باطل مخلوط ہیں۔ آخرت میں حق اور باطل جُدا جُدا ہو جائیں گے۔ اس دُنیا میں لوگ اپنے جائز حق اور مقام

سے محروم رہتے ہیں، آخرت میں ہر شخص کو وہ مقام مل جائے گا جس کا وہ مستحق ہے۔ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے جہاں لوگوں پر ظلم کیا جا سکتا ہے لیکن آخرت فیصلہ کی جگہ ہے جہاں کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اصحابِ جنّت اپنے اعمال کی جزا پائیں گے اور اصحابِ جہنّم کو ان کے اعمال کی سزا دی جائے گی مگر کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اصحابِ جنّت کی زندگی راحت، اطمینان، مسرّت اور سکون کی زندگی ہوگی، ہمیشہ قائم رہنے والی اور پھلنے پھولنے والی زندگی جس میں انہیں پاکیزہ ساتھی عطا کئے جائیں گے اور وہ قربِ الٰہی کی راہ میں آگے بڑھتے رہیں گے۔ اس کے برعکس اصحابِ جہنّم وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے اپنے عہد کو توڑنے کے مجرم ہیں۔ انہوں نے اس عہد کو توڑ کر نہ صرف اللہ کے حکم سے بغاوت کی بلکہ خود اپنی فطرت کے تقاضوں سے بھی انحراف کیا، پھر مجرمین کے خلاف گواہ پیش ہوں گے، ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کی بدعہدی اور بدمعاملگی کی گواہی دیں گے۔ پھر چوتھے رکوع کے آخر میں قوائے حسیہ اور اور قوائے عملیہ کا ذکر کیا گیا جنہیں انسان کو اس مقصد کے لئے عطا کیا گیا تھا کہ ان کے ذریعے وہ معرفت حاصل کرے اور عملِ صالح کی راہ میں سعی کرے۔ انسان ان صلاحیتوں کو ضائع کر دیتا ہے جبکہ یہ وہ صلاحیتیں ہیں جو انسان کو کائنات اور اللہ سے ہم آہنگ کر کے وحدتِ توحید کی طرف لے جانے والی ہیں۔ مگر لوگ ان صلاحیتوں کی قدر نہیں کرتے۔ ان کے تقاضوں کی طرف سے غفلت برتتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے کہا گیا ہے کہ اگر اللہ چاہے تو تمہاری آنکھوں کو مٹا بھی سکتا ہے پھر تمہاری مثال ان اندھوں کی طرح ہو جاتی جو اگر چاہیں بھی تو راستے پر سبقت نہیں کر سکتے اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں اپنی جگہ پر مسخ کر سکتا تھا پھر تم اس اپاہج اور مفلوج کی طرح ہو جاتے جو نہ آگے جا سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ یہ گویا پہلے رکوع میں پیش کی گئی ان انسانوں کی تصویریں ہیں جن کی گردن میں طوق ہے جن کی ٹھوڑی اوپر کو اٹھی ہوئی ہے اور وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ جن کے آگے اور پیچھے دیواریں ہیں اور وہ حرکت نہیں کر سکتے۔ بصیرت اور عمل دونوں سے محروم ہیں۔ یہ وہی

مجرمین ہیں جو اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر کے روحانی طور پر اس کیفیت میں آ چکے ہیں۔ یہی انکی حقیقت ہے جو اس دُنیا میں ظاہر ہو جائے گی کہ یہ دُنیا اس دُنیا ہی کی ایک مثل ہے۔

پانچویں رکوع کے آغاز میں انسان کی پوری زندگی کا قوس (CURVE) بیان کیا گیا ہے۔ انسان حالتِ ضعف میں پیدا ہوتا ہے رفتہ رفتہ طاقت بڑھتی ہے۔ جوانی میں طاقت اپنے کمال پر پہنچ جاتی ہے پھر جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے انسان حالتِ ضعف کی طرف پلٹتا جاتا ہے۔ یہی حال تمام دیگر صلاحیتوں کا ہے جنہیں وقت زوال اور فنا کی طرف دھکیلتا رہتا ہے۔ یہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ والی کیفیت ہے۔ یہ کیفیت اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ ہماری تمام صلاحیتیں اماناً مستعار ہیں اور اس کیفیت کا تقاضا ہے کہ انسان کو وقت کی جو کچھ مہلت میسر ہے اس میں وہ اپنی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کرے۔

اس کے بعد انسانی ہدایت کے دونوں سرچشموں یعنی رسول اور قرآن کا ذکر آتا ہے اسی ذکر سے اس سورت کا آغاز ہوا تھا۔ یہاں رسول کی عظمت اور اس کی شان کا تعارف کرایا گیا ہے اور پھر کتاب کا ذکر آتا ہے اور یہ بتایا گیا ہے اس کا مقصد مُردوں کو زندوں سے الگ کرنا ہے۔ یہ زندگی اور موت قلب کی بیداری اور غفلت سے عبارت ہے۔ جن لوگوں کے قلب بیدار ہیں وہ ہدایت کو قبول کرتے ہیں اور اس سے ان کی زندگی کی کیفیت بدل جاتی ہے اس کے برعکس جن کے قلب مُردہ ہیں وہ بظاہر زندہ رہنے کے باوجود غفلت کی وجہ سے موت کی حالت میں ہیں۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں کو جسے اس نے خلق کیا ہے انسانوں کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ گویا انسان پر اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے شکر کی ذمہ داری ہے۔ شکر ایمان کی کیفیت ہے جو تقویٰ یعنی آگاہی اور بیداری کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن انسان کی حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے منصوبۂ تخلیق میں سب سے بلند مقام عطا کیا مگر اس نے اپنی پیشانی کو ہر پست سے پست چیز کے سامنے جھکایا۔ اس نے اللہ کو چھوڑ کر شجر و حجر کو پوجا۔ فرعون، ہامان

اور قارون کو اپنا اِلٰہ بنالیا۔ وہ دولت، طاقت اور اقتدار کے بتوں کی پرستش کرنے لگا اور یہ سمجھنے لگا کہ وہ اس کی نصرت کرسکتے ہیں حالانکہ ان میں اس کی طاقت نہیں ہے۔ اس پرستش کا صرف یہ نتیجہ نکلا کہ وہ ظالم کا مددگار بن گیا وہ ظالم کے لشکر میں شامل ہوگیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو اطمینان دلا رہا ہے کہ لوگوں کی حالت اور ان کے قول سے تم حزن محسوس نہ کرو۔ اس لئے کہ جو اللہ پر توکل کرتا ہے اس کے لئے حزن و ملال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پھر دُنیا اور آخرت کی زندگی کے تناظر میں انسان کی سرکشی کا ذکر آتا ہے۔ انسان جس کی ابتداء حقیر ہے اور جسے اللہ تعالیٰ نے اختیار اور آزادی دی ہے اپنی آزادی کا اس قدر غلط استعمال کرتا ہے کہ وہ اللہ کا کھلا ہوا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے اور موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر اعتراض کرتا ہے وہ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ اللہ تعالیٰ میں تو یہ بھی قدرت ہے وہ درخت سے آگ پیدا کرسکتا ہے تو وہ اللہ جو ایک مادّے سے دوسرا مادّہ پیدا کرسکتا ہے اس کے لئے مُردہ انسان کو زندہ کرنے میں کیا دُشواری ہو سکتی ہے۔ وہ خلاقِ علیم ہے وہ ہر شے پر قادر ہے ہر شے کی ملکوت اسی کے ہاتھ میں ہے اور تمام چیزیں اسی کی طرف رجوع کررہی ہیں۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۖ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٨﴾

"اور جسے ہم عمر زیادہ دیتے ہیں اسے خلقت کے اعتبار سے پلٹا دیتے ہیں پس تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے۔"

یہ آیت پانچویں رکوع کی پہلی آیت ہے اور اس آیت کی ابتداء وَ سے ہو رہی ہے جس کے معنی ہیں اور۔ اس "وَ" کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ اس آیت کے مضمون کا پچھلی باتوں سے ربط قائم کرتا ہے اور "وَ" یعنی اور کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مضمون کی تبدیلی کی طرف اشارہ ہے۔

اس سے پہلے جو بات کہی گئی وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو آنکھوں کو مٹا دے

اور انسان کو اس کی جگہ پر مفلوج کر دے، پھر اگر لوگ چاہیں بھی تو نہ وہ راستے پر آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ اپنی حالت کو بدل سکتے ہیں۔ اور یہ کیفیت دو طرح ہو سکتی ہے۔ جسمانی طور پر اور روحانی طور پر۔ جسمانی طور پر آنکھوں کے محو ہونے یا انسان کے اپنی جگہ پر مسخ ہونے کی صورت یہ ہے کہ یہ دُنیا دار الامتحان ہے اور یہاں امتحان کے طور پر بعض لوگوں کو اس کیفیت میں مبتلا کیا جا سکتا ہے، لیکن بعض لوگ وہ بھی ہیں جن کے آنکھیں ہیں مگر وہ دیکھ نہیں سکتے اور جن کو جسمانی طور پر مسخ نہیں کیا گیا لیکن وہ صراطِ حق پر چلنے کی سعی نہیں کرتے بلکہ اپنی جگہ منجمد ہو گئے ہیں، یہ لوگ رُوحانی طور پر اندھے اور مفلوج ہیں یہ وہ ہیں جن کے متعلق کلام پاک میں یہ کہا گیا ہے کہ انہیں بندر یا سور بنا دیا گیا ہے، اس دُنیا میں ان کی اس باطنی کیفیت پر پردہ پڑا رہتا ہے قیامت میں ان کی یہ صورت ظاہر ہو جائے گی۔

بعض مفسرین نے اس آیت کا پچھلی رکوع کی آخری دو آیتوں سے ربط قائم کیا ہے کہ پچھلی دو آیتوں میں جو حالت بتائی گئی ہے یہ آیت اس کے امکان کا ثبوت ہے۔ کہ وہ جو قدرت کو ضعف سے بدل گیا ہے اور علم کو جہل سے اور ذکر کو نسیان سے۔ یہ اس امر پر قادر نہیں ہے کہ آنکھوں کو طمس اور حرکت کو مسخ کر دے۔ لیکن یہ تفسیر بے محل بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔ پچھلے رکوع میں اللہ کی قدرت کا نہیں بلکہ اس کے عدل کا ذکر کیا جا رہا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس امکان کے لئے کہ اللہ تعالیٰ طمس اور مسخ کر سکتا ہے کسی شہادت یا ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔

یہاں جس حقیقت کی نشاندہی کی جا رہی ہے وہ زندگی کا ایک ایسا قانون ہے۔ جو بلا استثناء اور بلا تخصیص ہر نیک و بد پر لاگو ہوتا ہے۔ انسانی زندگی ایک قوس کے مانند ہے۔ جہاں ہر کمال کے بعد زوال ہے، انسان کی تمام جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں ایک حد تک ترقی کرتی ہیں یہاں تک کہ ان کا نکتۂ عروج آجاتا ہے۔ انسان ضعف سے طاقت اور جہل سے عقل کی طرف ترقی کرتا ہے مگر جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے جسمانی قویٰ اور ذہنی صلاحیتیں

مضمحل ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور انسان بچپن کی حالت کی طرف پلٹنے لگتا ہے۔ عمر میں اضافہ کے ساتھ ساتھ انسان کی صلاحیتوں کا انحطاط اس بات پر دلیل ہے کہ انسان ان صلاحیتوں کا مالک نہیں ہے بلکہ یہ تمام صلاحیتیں اسے ودیعت کی گئی ہیں اور انہیں ایک خاص مدت کے لئے ودیعت کیا گیا ہے اور صلاحیتوں کا ایک خاص مدت کے لئے ودیعت کیا جانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انہیں کسی خاص مقصد کیلئے ودیعت کیا گیا ہے۔ پس عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس مقصد کی تلاش اور جستجو کرے اور انسان اپنی تمام صلاحیتوں کو اسی مقصد کے لئے استعمال کرے جس مقصد کے لئے انہیں ودیعت کیا گیا ہے۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۶۹﴾ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۰﴾

بے شک یہ تو ایک ذکر ہے اور قرآن مبین ہے (وضاحت سے بیان کرنے والا قرآن ہے)۔ اس کو متنبہ کرنے کے لئے جو زندہ ہے اور کافروں پر حجت تمام کرنے کے لئے)

ہم نے اس کو (اپنے رسولؐ کو) شعر نہیں سکھایا اور نہ یہ اس کے شایانِ شان تھا پہلی اس آیت کے ذیل میں یہ کہا گیا ہے کہ حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے شعر اور شاعری نہیں سکھائی تھی اس لئے آپؐ شعر وزن میں نہیں پڑھتے تھے۔ کسی استثنائی موقع پر اگر آپؐ کی زبان پر کوئی موزوں شعر جاری ہوا ہے تو وہ محض اتفاقی بات ہے۔ اس قسم کی بے معنی باتوں سے قطع نظر ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ اس آیت میں منصبِ رسالت کو منصبِ شاعری سے ممتاز کر کے شعر اور وحی کے فرق اور امتیاز کو بیان کیا جا رہا ہے۔ مشرکین عرب کی طرف سے حضورؐ پر تین اتہامات لگائے جاتے تھے۔ وہ لوگ آپؐ کو کاہن، شاعر یا مجنون کہتے تھے، اس آیت میں اس اتہام کی تردید کی جا رہی ہے اور وحی کو شعر سے ممتاز کر کے وحی کی حقیقت کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔

وحی کے لفظی معنیٰ

وحی کے لفظی معنیٰ ہیں اشارہ کرنا۔ اس میں رمز، کنایہ اور پر اسراریت کا پہلو پایا جاتا ہے، گویا وحی کے معنیٰ ہیں کسی راز یا غیب کی بات کو اشاروں میں بیان کرنا۔ لغتِ عرب میں وحی کے معنیٰ حروف کے بھی ہیں۔ اہلِ عرب پڑھے لکھے نہیں ہوتے تھے اس لئے اگر کوئی قدیم مخطوط نظر آتا تھا تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ کوئی رمز کی بات ہے جیسے کسی شخص نے کسی خاص شخص کے لئے لکھا ہے اور ان کے مفہوم کو یا لکھنے والا سمجھتا ہے یا وہ سمجھ سکتا ہے جس کے لئے یہ لکھے گئے ہوں باقی لوگوں سے اس مفہوم کو پوشیدہ رکھا گیا ہے۔

کلامِ پاک میں لفظ وحی کا استعمال

(۱) کلام پاک میں ایک موقع پر یہ بتایا گیا ہے کہ ہر نبی کے دشمن کچھ شیاطین الانس والجن ہوتے ہیں اور یہ ایک دوسرے کو وحی کرتے ہیں۔ اسی طرح شیطان جن لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ اس کے لئے کہا گیا ہے کہ شیطان اپنے اولیاء کو وحی کرتے ہیں۔

(۲) وحی کا ایک اور مقام وہ ہے جہاں پرندوں اور جانوروں کی مجیّر العقول جبلّی صلاحیتوں کو وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً شہد کی مکھی کا چھتہ بنانا۔ نحل کو وحی کی کہ وہ پہاڑوں میں اپنا گھر بنائے۔

(۳) وحی کا لفظ غیرِ نبی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، کلام پاک میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰ کی مادرِ گرامی پر وحی کی انہیں تابوت میں رکھ کر دریا کے سپرد کرنے کے متعلق اور ان کی رضاعت کے متعلق یعنی اللہ کے مخصوص نظامِ ہدایت کے تحت ایک مسئلہ کے حل کا خیال کی صورت میں دل میں وارد ہونا۔

(۳) کسی خاص صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اللہ اپنے نبی کو کوئی خاص راستہ تعلیم کرتا ہے تو اسے بھی وحی کہتے ہیں۔ مثلاً جب حضرت نوحؑ نے قوم کی غفلت اور سرکشی کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت کی کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مُطابق کشتی بناؤ۔ یا جس وقت فرعون کے جادوگروں نے اپنی رسیاں پھینکیں اور وہ سانپ بن گئیں تو حضرت موسیٰؑ کو وحی کی گئی کہ وہ اپنا عصا پھینک ڈالیں۔

(۴) جب اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص بندہ دوسروں سے اشارے میں کلام کرتا ہے حضرتِ زکریاؑ نے لوگوں سے اشاروں میں یہ کہا کہ وہ صبح و شام اپنے ربّ کی تسبیح کیا کریں۔ ان اشاروں کو بھی وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۵) کبھی کبھی آواز کو وحی کہا گیا ہے جیسے حضرت موسیٰؑ کو طور کے غربی جانب سے آواز دی گئی کہ میں تیرا ربّ ہوں۔ وحی کی یہ وہ صورتیں ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کسی ایک بندے سے خطاب کر رہا ہے۔ کسی خاص موقعہ پر کوئی ہدایت دی جا رہی ہے اور یہ ہدایت اسی خاص موقعہ تک محدود ہے اس کے بعد یہ بات ختم ہو جاتی ہے۔

وحی کی تین صُورتیں

کلامِ پاک میں وحی کی تین صورتیں بتائی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی بندے سے کلام نہیں کرتا مگر وحی کے ذریعے، یا حجاب کے پیچھے سے یا کسی پیغامبر (فرشتے) کو بھیجتا ہے۔ پھر وہ اللہ کے اِذن سے وحی کرتا ہے جو وہ (اللہ) چاہتا ہے۔

پہلی صورت:۔ اگرچہ وحی کی اصطلاح ان تینوں حالتوں کے لئے استعمال کی گئی ہے لیکن پہلی صورت میں وحی کا لفظ محدود معنوں میں استعمال ہوا ہے جس سے مراد ہے الہام یا جبلّت جیسے مادرِ موسیٰؑ پر وحی کی گئی، یا نحل پر وحی کی گئی۔ جناب موسیٰؑ (ان القِ

عصاک کا جو ذکر اوپر کیا گیا ہے اس کو بھی وحی کی پہلی قسم میں شامل کیا گیا ہے۔

وحی کی دوسری صورت پسِ حجاب سے آواز کا سنائی دینا ہے۔ اس صورت میں محض آواز سنائی دیتی ہے کوئی بولنے والا نظر نہیں آتا جیسے کوہِ طور پر حضرت موسیٰؑ کو آواز سنائی دی۔ اس وحی کو کلام کہا گیا ہے۔

اور من وراء حجاب وحی کی ایک صورت خواب بھی ہوتی ہے جیسے حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ گو مومنوں کو رویائے صادقہ کی بشارت ہے مگر اس قسم کے خواب صرف نبوت کے ساتھ مخصوص ہیں عام آدمیوں کا خود کو ایسے مرتبہ پہ گمان کرنا خود فریبی اور جھوٹ ہے۔

غرض وحی کی ایک صورت وہ ہے جس کا تعلق جبلت یا الہام یا اللہ کی خفیہ ہدایت سے ہے۔ ایک اور صورت وہ ہے جسے من وراء حجاب کہا گیا ہے جس میں کسی آواز یا خواب کے ذریعے ہدایت کی جاتی ہے اور وحی کی تیسری صورت وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کسی فرشتے کے ذریعے اپنا پیغام پہنچاتا ہے۔ وحی کی یہ سب سے جامع اور مکمل صورت ہے۔ وحی قرآنی اسی صورت سے نازل کی گئی۔

الہام یا جبلت کے ذریعے وحی یا من وراءِ حجاب کلام میں اللہ اور بندے کے درمیان اور کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ کسی خاص کام کے لئے مخصوص ہدایت ہوتی ہے جبکہ وحی مطلق فرشتے کے ذریعے بھیجی جاتی ہے اور یہ تمام انسانوں کے لئے عمومی ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے۔

صحیفۂ کائنات، صحیفۂ تاریخ اور صحیفۂ نفس میں ہر طرف اللہ کی آیات ہیں۔ اللہ جو رب العالمین، جو رحمٰن و رحیم ہے اور جو مالکِ یوم الدین ہے اپنی ربوبیت، اپنی رحمت اور اپنے عدل کی آیات کو ظاہر کرتا ہے کبھی لفظ و بیان کے ذریعے اور کبھی آثارِ فطرت کے روپ میں کبھی حوادثِ زمانہ کی صورت میں وحی قرآنی جو آیات کے نزول کی مکمل صورت ہے اس میں

بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، رحمت اور عدل کی شانیں جھلکتی ہیں ۔ ربوبیت و رحمت کی شان ہے کہ اس میں عقل و روح کی تربیت اور ترقی کے لئے نصیحت و ہدایت اور رحمت و شفاء ہے جس طرح جسم کی تربیت اور ترقی کے لئے غذا کی ضرورت ہے۔ اور اللہ نے اس کو مہیا کیا ہے اسی طرح انسانیت کے ہر پہلو کے کمال اور ترقی کے لئے اللہ نے یہ روحانی تغذیہ مہیا کیا ہے اور اس میں عدل کی شان ہے کہ اس کے ذریعے اللہ نے بندوں پر حجت قائم کر دی اور انسان کے لئے گمراہی کا کوئی عذر نہیں رہا۔

قرآنی وحی، وحی کی خاص الخاص صورت ہے۔ اس کی دو جہتیں ہیں۔

یہ پہلی جہت اللہ کی طرف سے روح الامین کے ذریعے قلبِ محمدؐ پر اللہ کے کلام کی تنزیل۔

دوسری جہت اللہ کی طرف محمد مصطفیٰؐ کے وسیلہ سے تمام عالمِ انسانیت کے لئے صاف۔ ظاہر۔ بامحاورہ عربی زبان میں (لسان عربی مبین) ابلاغ۔

پہلی جہت ۔۔ جہت تنزیل

(۱) یہ کلام الٰہی ہے جس کا مقام لوح محفوظ ہے۔ کتاب مکنون (پوشیدہ نوشتہ) ہے۔

(۲) اس کو نازل کرنے کا واسطہ جبرئیل ہیں جو قوت و صدق و امانت کا مظہر ہیں۔

(۳) یہ محمد مصطفیٰؐ کے قلب پر نازل کیا گیا ہے جس طرح قرآن کے لئے "انزل" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اسی طرح محمد مصطفیٰؐ کے لئے ارسل کا لفظ نازل کیا گیا ہے۔ گویا جن بلندیوں سے قرآن نازل کیا گیا ہے اسی بلندی سے محمد مصطفیٰؐ کو بھیجا گیا ہے اور ایک خاص عہد کے لئے اور مقصدِ تخلیق کی تکمیل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔

(۴) جو شے نازل ہوئی ہے قلبِ محمدؐ مصطفیٰ جس کا متحمل ہوا ہے وہ اگر پہاڑوں پر نازل کی جاتی تو اس کے عظمت اور خوف سے ریزہ ریزہ ہوجاتے۔

یہ پہلی جہت تنزیل کی اللہ اور اس کے عبد کے مابین رابطہ ہے، عہد ہے جو ایک رمز اور راز ہے۔ یہ حریمِ قدس کا ماجرا ہے جہاں کسی کو دخل نہیں ہے۔

إِنَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ

کہا گیا کہ محمد بشرٌ مثلکم ہے، وحی ایک خاص ملکہ ہے جو ان کو عام بشر سے ممتاز کرتا ہے۔ نزولِ وحی کے وقت فطرتِ بشریہ دب جاتی ہے۔ فطرتِ ملکیہ ابھرتی ہے اور نزولِ وحی کے وقت جسمانی تبدیلیوں اور علامات کو بھی بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

یہ سب اور اس قسم کی باتیں زیادہ سے زیادہ ایک کیفیت یا حال کا ذکر ہے مگر جس پر یہ حال وارد ہوتا ہے اس کے مقام کی بھی تو تھوڑی بہت معرفت حاصل کرو۔ بغیر مقام کے حال سمجھ میں نہیں آسکتا۔ حال تو سمندر کا طوفان ہے، سمندر کے قلب کی گہرائیوں سے ایک لہر اُٹھ رہی ہے جو تمام ممکنہ بلندیوں کی آخری حد کو چھو رہی ہے کہ چاند کے پیغام کا استقبال کرے۔

مگر اس سمندر (حقیقتِ محمدیؐ) کو بھی دیکھا جس میں کائنات ایک جزیرہ ہے۔ اس سمندر کی گہرائی کا بھی اندازہ کیا جو عرشِ الٰہی کا مقام ہے، وہ جس کی شان ماینطق الا مایوحیٰ ہے اس کے نطق کا سرچشمہ کیا ہے۔

دوسری جہت، ابلاغ۔ بلاغِ مبین

(۱) یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس میں کلام کی جملہ خصوصیات موجود ہیں۔ لسانِ عربی مبین ہے۔ بامحاورہ عربی زبان ہے جو بولی جاتی ہے اور جس سے بات کی جائے وہ بقدرِ فہم اس کو صاف صاف سمجھ لے۔ یہ کلمہ ہے۔ یہ قول ہے۔ ایک ڈائیلاگ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ صاف۔ ظاہر۔ روشن۔

(۲) یہ کلام محمد مصطفےٰ پر وحی کے ذریعے نازل ہوا ہے، وحی یہ نہیں ہوئی ہے کہ خدائے محمد الہ واحد ہے بلکہ عالمین کا الہ (انا الھکم الہ واحد) الہ واحد ہے۔ گویا وحی محمدؐ عالمین کے لئے حجّت ہے۔ یہ پیمبر کا مقام ہے کہ اس کی وحی کے دوسرے لوگ پابند ہوں۔ سوائے پیمبر کے اور کسی کا یہ مقام نہیں۔

(۳) یہ کلام محمدؐ مصطفےٰ پر تمام انسانی کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے خدا اور انسان میں رب اور عبد میں ایک مُناسبت ہے۔ اللہ ہر بندے کے رگِ جان سے قریب ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بندہ اس سے دُور ہو جائے۔ سبحان اللہ حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں۔

یار نزدیک تراز من بہ من ست　　　ویں عجب ترکہ من از وے دورم
چہ کنم، باکہ تواں گفت کہ دوست　　　درکنارِ مَن و مَن مہجورم

وہ سب سُن چکا ہے اور لبیک کہہ چکا ہے۔ کہنے والا ہر سننے والے اور بولنے والے سے اسی کی زبان میں بات کرتا ہے۔

بنامِ او کہ او نامے ندارد　　　بہ ہر نامے کہ خوانی سر بر آرد

(۴) گویا محمد مصطفےٰ کے وسیلے سے انسان اللہ تعالےٰ سے ہم کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت و رحمت سے انسان کی ہدایت کے لئے اس سے بات کر رہا ہے اور وہ اپنی بات کے جواب کا انتظار کر رہا ہے۔ بغیر باہمی افہام و تفہیم کے مالک اور عبد کا رشتہ کس طرح ممکن ہے۔

اور جواب میں جو وہ اللہ کی دعوت پر دیتا ہے انسان کی شناخت اور تقدیر کا راز مضمر ہے۔ اگرچہ اس احساس اور تجربہ کے ہم متحمل نہیں ہوسکتے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ آیات ہمارے لئے قلب پر نازل ہو رہی ہیں مگر یہ تو ایک زندہ حقیقت ہے کہ اللہ کا رسولؐ اللہ کی آیات ہم پر تلاوت کر رہا ہے۔

ذکر / قرآنِ مبین

منصبِ رسالت کے تعارف کے ساتھ ساتھ کتاب کا تعارف بھی کرایا جارہا ہے وہ کتاب جس کا مقام لوحِ محفوظ ہے، علم الٰہی اور قلب محمدؐ ہے اور دوسری طرف جو تمام لوگوں کے لئے لسانِ عربی مبین میں رحمت اور ہدایت ہے۔ اور اس کے لئے دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں ذکر اور قرآن مبین۔

قرآن مبین وہ کتاب ہے جس میں لوحِ محفوظ کی مخفی حقیقت کو عربی مبین میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے اندر ان حقیقتوں کو محفوظ کیا گیا ہے جن کی طرف بار بار رجوع کیا جاتا ہے۔ قرآن کی تلاوت کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ کتاب بار بار پڑھے جانے کے لئے ہے تاکہ قلبؐ بصر کا نور بن جائے۔ "تلاوت" کسی کے پیچھے پیچھے اس طرح چلنے کو کہتے ہیں کہ درمیان میں کوئی اجنبی چیز حائل نہ ہو۔!

ذکر حقیقت کا استحضار ہے۔ یہ بھولی ہوئی حقیقتوں کو یاد رکھنے کا قرینہ ہے۔ "کلام" "وظیفۂ حیات کے طور پر" ذکر "ہے اور تلاوت کے لحاظ سے" قرآن "ہے۔ ذکر کا تعلق مخصوص تصفیۂ قلب سے ہے، تلاوت کا تعقل اور تفکّر کے ساتھ ہے۔ یہ وہ وظیفہ ہے جس سے بھولی ہوئی حقیقت محفوظ کی جاتی ہے اور ذکر کی کیفیت حضوری کی ہوتی ہے جب انسان ہر لمحہ الست بربکم کی صدا سنتا ہے اور ہر لمحہ اس کی روح کا ہر ذرّہ پوری توانائی کے ساتھ بلیٰ کہتا ہے۔ ذکر عہد الست کی تجدید ہے۔ ہر لمحہ آگاہی اور بیداری کی کیفیت ہے اور ذکر اللہ اور بندے کا مکالمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا، میں تمہیں خطاب کرتا ہوں تو تم اس خطاب کا جواب دو اور جب بندہ حالتِ اضطرار میں اپنے خدا کو پکارتا ہے تو خدا اس کا جواب دیتا ہے۔

قرآن کے ساتھ ذکر کا لفظ بار بار آیا ہے، ایک اور لفظ جو قرآن کے ساتھ استعمال

ہوا ہے وہ بے نور۔ قرآن حقیقت کا بیان ہے، ذکر اس حقیقت کا استحضار ہے اور اس کے نتیجہ میں انسان کے قلب میں نور پیدا ہوتا ہے۔ مومنوں کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ظلمت سے نور کی طرف نکالتا ہے، خود اللہ تعالیٰ نور ہے، گویا ظلمت سے نور کی طرف سفر اللہ کی طرف سفر ہے اور یہ قربِ الٰہی کی منزل ہے۔

وحی قرآنی کا مقصد یہ ہے کہ جو زندہ ہیں یعنی جن کے سمع، بصر اور قلب پر غفلت کی مہریں اور پردے نہیں پڑے ہوئے ان کو زندہ کیا جائے یعنی ان کی غفلت کو دور کیا جائے ان کے قلب کو بیدار کیا جائے ان کی سماعت اور بصارت کو زندہ کیا جائے، زندہ وہی ہے اور اسی حد تک زندہ ہے جس کا قلب جتنا زندہ ہے ورنہ انسان ایک چلتی پھرتی قبر ہے اور وحی کے پیغام کو وہی قبول کر سکتا ہے جس کا قلب زندہ ہو اور جس میں زندگی کی کیفیت جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر اس پیغام کو قبول کرتا ہے۔

وحی کا ایک مقصد انذار ہے یعنی لوگوں کو راستے کے خطرات سے متنبہ کرنا۔ اس راستہ میں انسان کی ہدایت اور رہنمائی کرنے والا خود اللہ تعالیٰ ہے جو انسان کا ہر حال میں رفیق ہے۔ رفیقِ اعلیٰ ہے اور اس راستہ کی منزل بھی وہی اللہ ہے۔ اور وحی کا دوسرا مقصد لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے قولِ عذاب کو محقق کرنا ہے جس کی مختلف صورتیں ہم پہلے رکوع کے مطالعہ کے ذیل میں واضح کی جا چکی ہیں۔ گویا اس وحی کے ذریعے ایک طرف ہدایت کے دروازے کھل رہے ہیں تو دوسری طرف غافل لوگوں پر حجت تمام کی جا رہی ہے۔

خلاصہ یہ کہ منصبِ رسالت وہ مخصوص اور ممتاز منصب ہے کہ جس پر کسی دوسرے سماجی منصب کا قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ رسالت کا منصب ہر شخص کے لئے نہیں ہے اور نہ کوئی شخص اپنی سعی سے اس منصب کو حاصل کر سکتا ہے۔ زیرِ مطالعہ آیت میں رسول کے منصب کو شاعر کے منصب سے ممتاز کر کے یہ بتایا جا رہا ہے کہ منصبِ رسالت اللہ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص اور مصطفےٰ بندوں کو رسول بنا کر

بھیجتا ہے اور جسے اللہ تعالیٰ رسول بناتا ہے اس کے قلب پر وحی نازل کرتا ہے وحی کا ایک رُخ پیغمبرؐ کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان مکالمہ راز ہے اور وحی کا دوسرا رُخ تمام انسانیت سے متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کے ذریعہ تمام انسانیت سے خطاب کرتا ہے اور اس وحی کا مقصد یہ ہے کہ زندوں کو مُردوں سے الگ کیا جائے یعنی جن کے قلب زندہ ہیں انہیں ہدایت کا راستہ دکھایا جائے اور جن کے قلب مُردہ ہو گئے ہیں ان پر حجت تمام کر کے قولِ عذاب کو محقق کیا جائے۔

نبی اور شاعر

اس موضوع پر تین حیثیتوں میں گفتگو کرنا مقصود ہے۔

① عرب جاہلیت میں شعر کی روایت اور حضورؐ پر اتہام

② کلام پاک میں شعر اور شاعر کے متعلق بیان

③ نبی اور شاعر میں فرق

○ عرب جاہلیت میں شعر کی روایت اور حضورؐ پر اتہام

عربی میں شاعر کا لفظ شَعَرَ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ہیں جاننا اور محسوس کرنا۔ لفظ شعور بھی اسی شَعَرَ سے نکلا ہے، شعر کے ایک اور معنیٰ بال کے ہیں اس لحاظ سے شاعری باریک اور لطیف باتوں کا ابلاغ اور اظہار ہے۔

عرب میں شاعری کی روایت بہت قدیم ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت یہ روایت کافی ترقی کر چکی تھی۔ اگر ظہورِ اسلام کے وقت کے عرب معاشرہ کو جاہلیت جدیدہ سے تعبیر کیا جائے تو پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ معاشرہ جاہلیتِ قدیم کے مقابلہ میں اکثر باتوں میں کافی ترقی کر چکا تھا، جاہلیتِ قدیم کے معاشرہ میں دو باتوں کا بہت زور تھا ایک کہانت اور دوسرے شاعری اس لحاظ سے معاشرہ میں کاہن اور شاعر کا منصب

خصوصی اہمیت کا حامل تھا اور عام طور پر یہ دونوں منصب کسی ایک ہی شخص کے پاس ہوتے تھے، اس دور کے لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ کاہن اور شاعر کا تعلق کسی جن سے ہوتا ہے۔ کاہن جو پیشین گوئی کرتا ہے وہ اس کے اپنے الفاظ نہیں ہوتے بلکہ کوئی جن اسے یہ الفاظ تعلیم کرتا ہے اسی طرح شاعر جو شعر کہتا ہے وہ بھی جن کی طرف سے القاء کیا جاتا ہے جو شاعر پر زبردستی مُسلّط ہو جاتا ہے اسی لئے وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ شاعر کے لفظوں میں جادو ہوتا ہے اور چونکہ شاعر کا تعلق کسی غیر مرئی طاقت یعنی جن سے تسلیم کیا جاتا تھا اس لئے ہر قبیلہ کے لوگ اسے اپنا سربراہ مان لیتے تھے گویا جاہلیتِ قدیم میں کہانت، شاعری اور قبیلہ کی سرداری کے تینوں منصب کسی ایک ہی شخص سے متعلق ہوتے تھے اور اس شخص کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کا تعلق کسی جن سے ہے۔

ظہورِ اسلام کے وقت یعنی جاہلیت قریب میں کہانت اور شاعری کے منصب جُدا جُدا ہو چکے تھے، کہانت ایک باقاعدہ پیشہ بن گئی تھی، جہاں تک شاعر کا تعلق ہے اس کے متعلق جاہلیتِ قدیم کا یہ تصور کہ اس کا تعلق کسی جن سے ہے بہت حد تک ماند پڑ چکا تھا، شاعری ایک ترقی یافتہ آرٹ بن چکی تھی، مگر اب بھی شاعر کو قبائلی زندگی میں ایک اہم مقام حاصل تھا اور شاعر کا کسی قبیلہ میں ہونا اس قبیلہ کے لئے اعزاز تھا۔ یہ دور قبائل کی باہمی رقابت اور جنگ و جدل کا دور تھا اور ان جنگوں میں شاعر کا کردار ایک مؤثر نفسیاتی حربہ کی حیثیت رکھتا تھا اس لئے کہ اس کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے قبیلہ کی قصیدہ خوانی کرے اور اپنے حریف قبیلہ کی ہجو لکھے، قصیدہ اور ہجو عربی شاعری کی دو اہم اصناف ہیں۔ ظہورِ اسلام کے وقت عرب کی شاعری میں قصیدہ اور ہجو لکھنے کا بہت زور تھا اور اسلام دشمن شعراء حضورؐ کی ہجو میں اشعار لکھتے تھے جن کا جواب حسان بن ثابت اور دوسرے شعراء کی طرف سے دیا جاتا تھا اور حضورؐ اس پر پسندیدگی کا اظہار بھی فرماتے تھے اور کیونکہ حضورؐ کی قصیدہ خوانی کرنے والے شعراء

کا مقصد نیکی کی راہ میں سعی کرنا ہوتا تھا۔ اس لئے حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ایسے شعراء کو روح القدس کی طرف سے مدد اور تائید حاصل ہوتی ہے۔

کہانت کا ایک باقاعدہ پیشہ تھا۔ پیش گوئی کا۔ کاہن اپنے اوپر ایک خاص کیفیت طاری کر لیتا تھا اور الفاظ جو اس کے منہ سے نکلتے تھے وہ پُر اسرار، سجع کی صورت میں ہوتے تھے اور ان میں قسمیں بھی بہت ہوتی تھیں! اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ پیش گوئی جن کر رہا ہے۔

مشرکین حضورؐ پر (معاذ اللہ) کاہن، شاعر اور مجنون (جن کے زیر تسلط ہونے کے) الزام لگاتے تھے۔ وہ آیات قرآنی کے طرز کو اور وحی کی کیفیت کو کہانت کی زبان اور کیفیت پر قیاس کرتے تھے۔ انبائے غیب حشر اور قیامت اور مبدا اور معاد کو خیالی باتیں کہتے تھے اور کہانت کی پیش گوئی سے تعبیر کرتے تھے اور کلام پاک کے سامعین کے قلب پر اثر کو شاعری کا جادو کہہ کر زائل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں جاہلیت قدیم میں کہانت اور شاعری کا تعلق جن سے سمجھا جاتا تھا اور مجنون ایسے شخص کو کہتے تھے جس پر جن کا تسلط ہو۔ اب اگر ہم علمی سطح پر ان اتہامات کا تجزیہ کریں تو یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی کہ یہ تمام اتہامات محض چند ظاہری مماثلتوں پر مبنی تھے اور ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

(۲) شعر اور شاعر

سورہ الشعراء کی ۲۲۱ سے ۲۲۷ تک آیات کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:-

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر نازل ہوتے ہیں۔

وہ ہر بہتان لگانے والے گنہگار پر نازل ہوتے ہیں۔

وہ (لغو باتوں پر) کان دھرتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں۔

اور گمراہ لوگ شعراء کی پیروی کرتے ہیں۔

کیا تو نہیں دیکھتا کہ وہ ہر وادی میں بہکے ہوئے پھرتے ہیں
اور وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔
سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور اعمالِ صالح بجا لائے اور کثرت سے اللہ کی یاد کی اور اپنے اوپر ظلم کئے جانے کے بعد بدلا لیا۔ اور لوگ جنھوں نے ظلم کیا عنقریب جان لیں گے کہ وہ کس حالت میں پلٹتے ہیں (کیا انجام ہوگا)۔

شعر ایک ملکہ ہے ایک قوت ہے، قوتِ بیان جو اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ ہر ملکہ کی تربیت کے شرائط ہیں اور اس کا زندگی میں ایک خاص مقصد اور مقام ہے۔ اگر اس کی صحیح تربیت کی شرائط پوری نہیں ہوتیں اور اس کا مقصد و مقام سے انحراف ہو جاتا ہے تو پھر فساد کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

اگر شاعر کی طبیعت میں خود انتشار اور پراگندگی ہے، اگر وہ ہر بدلتی ہوئی کیفیت میں خود بہکا ہوا اور سرگرداں پھرتا ہے۔ اگر اس کے قول و فعل میں کوئی مطابقت نہیں ہے اگر وہ محض لوگوں کو خوش کرنے کے لئے یا ان کے شہوت اور غضب کے جذبات مشتعل کرنے کے لئے یا لوگوں کو متاثر کر کے اپنا ایک مقام پیدا کرنے کے لئے اپنی خداداد قوتِ اظہار کو صرف کرتا ہے تو وہ حزب الشیطین میں داخل ہو جاتا ہے، معاشرہ میں منکر اور فحشاء کو پھیلانے کیلئے ایک مرکز بن جاتا ہے اور گمراہ لوگ اس کے پیچھے لگ لیتے ہیں۔

شعر کی قوت کی صحیح تربیت کے لئے جو شرائط بتائی گئی ہیں۔

(۱) إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا ـ موجودہ سیاق میں قوتِ شعر کی تربیت کے لحاظ سے اس کا نفس خواہشات کی ہوا میں بے شیرازہ ورق ورق منتشر نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایک جمعیت ہے، ایک سمت میں مقصد و معنی ہیں، ایک گہرا COMMITMENT ہے۔

(۲) وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ـ اور اس کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہے، منافقت نہیں ہے۔ اس کا شعر ہر گزرتی ہوئی خیالی کیفیت کا اظہار نہیں ہے اس کے

طبیعت کے ریاض اور اس کی شخصیت کے گہرے تجربہ کا اظہار ہے۔

(iii) وَذَكَرُوا اللهَ كَثِيرًا ـــ اور ذکر و فکر اس کی زندگی کی عادت بن چکی ہے۔ اس کی تمام جد وجہد زندگی کی کُلّی معنی اور مقصد تک رسائی کے لئے اور کائنات کے حق اور حسن کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ہے۔

(iv) وَانْتَصَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا ـــ اور وہ ظلم کی مخالفت، قیام عدل اور ظلم کے خلاف احتجاج کر کے معاشرہ کے ساتھ اپنی ذمہ داری کو پورا کرتا ہے۔

عمومی طور پر شعر کا رجحان انتشارِ فکر کی طرف ہے، اس کی کوئی سمت یا نہج مقرر نہیں ہے، شاعر اپنے قلب کی ہر وقتی اور عارضی کیفیت کو ایک خوبصورت اور جاذب پیرایۂ اظہار دیتا ہے گویا وہ ہر وادی میں سرگرداں پھرتا ہے اور اس کے کلام کو اس کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن اگر شاعر ایمان اور عمل اور ذکر اور ظلم کے خلاف مقاومت کے ذریعہ اپنی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے تو شعر ان خطرات سے بچ جاتا ہے جو شاعر کو شیطانی زمرہ کی طرف لے جاتے ہیں اور اس میں عرفانِ حقیقت کی نظر اور ظلم کی مخالفت کی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے اور شاعر حزب اللہ میں شامل ہو جاتا ہے اور رُوح القدس کی تائید اس کو میسر ہوتی ہے۔

③ نبی اور شاعر

(i) شعر ایک ملکہ ہے جو اللہ تعالیٰ انسان کو عطا کرتا ہے۔ نبوّت کوئی ملکہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے نظامِ رحمت و ہدایت کا ایک لازمی حصّہ ہے۔

(ii) ملکۂ شعر کا غلط یا صحیح استعمال ہو سکتا ہے۔ وحی کو اللہ تعالیٰ روح الامین کے ذریعے اپنے مصطفےٰ بندے (نبی) کے قلب پر نازل کرتا ہے تاکہ نبی لوگوں کو راستے کے خطرات سے آگاہ کر کے ان کی صحیح ہدایت کرے۔

عدلِ الٰہی کے واسطے سے یہ بندوں کا اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ کوئی قریہ ہلاک

نہ کیا جائے جب تک کسی نذیر کے ذریعہ اس پر حجت تمام نہ کی جائے۔

(iii) شیطان ان پر نازل ہوتا ہے جو افواہ طراز، کاذب، فساد اور فحشا پھیلانے والے والے ہیں شعر کی قوت کو غلط استعمال کرنے سے شیطان کے اغوا کا قوی احتمال پیدا ہوتا ہے۔ وحی لوگوں کو موت سے زندگی کی طرف اور ظلمت سے نور کی طرف ہدایت کرنے والی ہے، وحی ذکر ہے، حقیقت ہے، نصیحت ہے۔ شیطان کا حقیقت اور نصیحت سے کوئی واسطہ نہیں، یہ اس کا رول نہیں ہے، یہ شیطانی ذات کی نفی ہے کہ وہ وحی کو چھوئے وہ تو مس بھی نہیں سکتا۔

(iv) شاعری کی کوئی نہج مقرر نہیں ہے۔ انفعالی کیفیت حال بہ حال بدلتی ہے، انسانی قلب کی تمناؤں کا، خوابوں کا، بے اطمینانیوں کا، بے چینیوں کا، آرزوؤں کا اظہار ہے۔

وحی ایک معروضی حقیقت واحدہ کا ایک ظہور ہے، علیٰ صراطِ مُستقیم ہے، اللہ اس کا سرچشمہ ہے، اسی کی طرف اس کی بازگشت ہے، اس میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔

(v) قول اور عمل کی مطابقت شاعر کی بہ حیثیت شاعر ذمہ داری نہیں ہے، شاعر جو کہتا ہے وہ کرتا نہیں ہے۔

صاحب وحی اسوۂ حسنہ رکھتا ہے، اس کی سیرت قرآن ہوتی ہے۔

(vi) شعر زندگی کو ترقی دینے والی طاقت بن سکتا ہے لیکن شعر کا بہ حیثیت شعر یہ منصب نہیں ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، عام طور سے گمراہ لوگ ہی شاعر کا اتباع کرتے ہیں۔

نبی کا حق یہ ہے کہ اس کو سُنا جائے، اس کی اطاعت کی جائے، اس کی نصرت کی جائے، اس کا اتباع کیا جائے۔

(iii) شعر کا اثر جمالیاتی لذت ہوتا ہے یا اصلاح یا کسی نیک کام میں ترغیب اور شراکت۔

نبی کی تعلیم کا اثر الحیٰوۃ الدنیا میں سے الحیٰوۃ الطیبہ کو، ایمانی دُنیا کو نکالنا موت سے زندگی کی طرف لے جانا ہے، شعور و نظر، اقدار و عمل میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کرنا ہے، اور نیا انسان تعمیر کرنا ہے، ایک نئی دُنیا پیدا کرنا ہے۔

ہم نے سورۂ یٰسین کے پانچویں رکوع کی ابتدائی تین آیات کا مطالعہ کیا۔ اس میں وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ کہہ کر حیات کا طبعی قانون بیان کیا گیا ہے پھر وحی و رسالت کی حقیقت اور اس کے مرتبہ اور مقام کو بیان کر کے ہدایت اور زندگی کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔ ہدایت کا مقصد ان لوگوں کو انذار کرنا ہے جو زندہ ہیں، یہ زندگی کی دوسری سطح ہے جو طبعی سطح سے مختلف ہے یہ حیاتِ دُنیا کے اندر سے حیاتِ طیبہ کا ظاہر ہونا ہے جو ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے، حیاتِ طیبہ زندگی کی کیفیت ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ یہ وہ زندگی ہے جو ختم ہونے والی نہیں ہے طبعی سطح پر موت زندگی کا اختتام ہے مگر حیاتِ طیبہ کی سطح پر موت زندگی کو ختم کرتی بلکہ اس کی حالت کو بدل دیتی ہے۔

اب ہم اس کے بعد کی تین آیتوں کا مطالعہ کریں گے:

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُم مِّمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ ﴿٧١﴾ وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُونَ ﴿٧٢﴾ وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۖ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٧٣﴾

(کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جو چیزیں ہم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنائیں ان میں سے ہم نے ان کے لئے چوپائے پیدا کئے اور انہیں ان کا مالک بنا دیا اور ان کو ان کے قابو میں کر دیا تو کوئی ان میں سے ان کی سواری ہے اور کسی کو یہ کھاتے

ہیں اور ان میں ان کے لئے اور فائدے اور پینے کی چیزیں ہیں تو یہ شکر کیوں نہیں کرتے)۔

ان آیات کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے پس منظر کے طور پر چند نکات کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ سورہ یٰسین ایک معنوی وحدت ہے لیکن ہم اپنی تفہیم اور ابلاغ کی سہولت کے لئے اس سورہ کے مضامین کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مضامین کے پہلے حصہ میں کتاب و رسول کا ذکر کیا گیا ہے پھر یہ بتایا گیا ہے کہ کون لوگ ہدایت کو قبول کرتے ہیں اور کون ہدایت کا انکار کرتے ہیں اور یہ کہ ہدایت کو رد یا قبول کرنے کے نتیجہ میں زندگی پر کس طرح کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اور پھر یہ بتایا گیا ہے کہ ان اثرات کا احاطہ حیاتِ دُنیا اور حیاتِ آخرت دونوں پر محیط ہے اس لئے کہ دُنیا اور آخرت کی زندگی ایک وحدت ہے اور حیاتِ آخرت دراصل حیاتِ دُنیا کا تسلسل اور اسی کا دوسرا روپ ہے۔ یہ مضمون سورۃ یٰسین کے پہلے اور دوسرے رکوع میں بیان کیا گیا ہے اور پھر اسے پانچویں رکوع کی ابتدائی تین آیات میں ایک دوسری سطح پر پیش کیا گیا ہے، جہاں تک پانچویں رکوع کا تعلق ہے اس رکوع میں اس سورۃ کے تمام مضامین کو ایک نئے تناظر میں پیش کر کے ان مضامین کو مکمل کیا گیا ہے۔

مضامین کے دوسرے حصہ میں دُنیا کے حالات، ماحول، تنظیم اور توازن کا ذکر کیا گیا ہے، زندگی کے ظہور، تربیت، بقاء اور ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تذکیر بالآء اللہ کے ذریعے اس حقیقت کو روشن کیا گیا ہے کہ اس دُنیا میں انسان کے لئے زندہ رہنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ یہ مضمون تیسرے رکوع میں بیان کیا گیا ہے اور پھر اسے پانچویں رکوع کی زیرِ مطالعہ آیات میں دُہرایا گیا ہے۔

مضامین کا تیسرا حصہ حیاتِ آخرت سے متعلق ہے جس کا ذکر چوتھے رکوع میں آتا ہے اور پھر پانچویں رکوع میں اس کا ذکر زیرِ مطالعہ آیات کے بعد آئے گا۔

اس وقت ہم جن آیات کا مطالعہ کر رہے ہیں ان کے مفہوم کو اس طرح ترتیب دے سکتے ہیں:

(i) چوپایوں کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے جس نے سب کو (مع انسانوں کے) پیدا کیا ہے اس کارِ تخلیق میں اور کوئی شریک نہیں ہے۔ خود یہ بات کہ ان کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ ان میں ایک اختصاص پیدا کر دیتی ہے۔

(ii) پاپیدینا اور جانوروں کی تخلیق کوئی ہلکی یا معمولی بات نہ سمجھی جائے (پاپیدینا: اپنے دونو ہاتھوں سے) ان کی خلقت میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تامہ اور اور قدرتِ کاملہ کا اظہار ہے۔

(iii) ہم ان (انسانوں) کے لئے۔ اس میں مراتبِ وجود کی طرف اشارہ ہے۔ وجود کا ایک سلسلہ پست سے اعلیٰ کی طرف جاری ہے۔ پست ترین درجہ جمادات کا ہے کہ وجود ہے نمو نہیں ہے، پھر نباتات کا نمو ہے حرکت نہیں، اس سے بلند حیوانات کا کہ حرکت و احساس ہے لیکن تعقل و شعور نہیں۔ سب سے بلند درجہ انسان کا ہے کہ اس میں خود آگاہی اور تعقل ہے۔ انفعالیت کے ساتھ فعالیت ہے وسیع تر دائرہ میں اختیار و آزادی ہے شعور اور باطنی زندگی ہے۔ وحدتِ نفس اور انفرادیت ہے۔ ماضی کی یاد اور عاقبت بینی ہے۔

ان مراتب میں ہر پست درجہ کا موجود اعلیٰ تر درجہ کے موجود کا خادم ہے۔ اس سے مسخر ہے اور اس کے لئے فائدہ رساں ہے۔ گویا ہر پست درجہ کی مخلوق بلند تر درجہ کی مخلوق کے "لئے" ہیں۔ اس "لئے" میں تسخیر، خدمت اور فائدہ کے معنی شامل ہیں، اس معنی میں اللہ نے چوپایوں کو انسانوں کے لئے پیدا کیا ہے۔

یہیں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کی بنا پر اپنے اللہ کے لئے اور محض اپنے اللہ کے لئے ہے۔

(۱۷) أَوَلَمْ يَرَوْا کیا کبھی انسان نے کائنات میں اپنے مقام پر غور کیا ہے اور سوچا ہے کہ اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے اس کی کیا ذمّہ داریاں ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو خلق کیا اور انسان کو ان کا مالک بنا دیا۔ انہیں انسانوں کے لیے مسخر کر دیا، وہ سواری کے کام بھی آتے ہیں، ان کا گوشت کھایا جاتا ہے ان سے پینے کے لیے دودھ حاصل کیا جاتا ہے اور بھی ان سے کئی فائدے حاصل کئے جاتے ہیں۔ پس انسان اللہ کا شکر ادا کیوں نہیں کرتے۔

اِس سے پہلے کی آیات میں یہ بتایا جا رہا تھا کہ وحی و رسالت کا مقام کیا ہے اور یہ کہ ہدایت کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو زندہ کیا جائے اور کافروں پر حجت تمام کی جائے۔ اس کے بعد فوراً جانوروں کی تخلیق کا ذکر آ گیا، بظاہر اِن دونوں باتوں میں کوئی ربط اور تعلق نظر نہیں آتا لیکن جیسا واضح کیا گیا ہے دیکھا جائے تو یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہیں۔ پہلے حصّہ میں اِنسان اور اللہ کا تعلق، نبی اور کتاب کے واسطہ سے واضح کیا گیا، ایک طرف ہدایت کا، دوسری طرف اطاعت کا اور نتیجہ میں ایک نئی زندگی پانے کا، یہاں کائنات میں اِنسان کے مقام کی توضیح کی جا رہی ہے اور اس مقام کی ذمّہ داری کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں۔ سورۃ یٰسین کے مضامین کا دوسرا حصّہ تذکیر بآلاءِ اللہ پر مشتمل ہے تاکہ انسان سوچے کہ ان انعامات کا تقاضہ کیا ہے اور اس کے لئے زندگی کا صحیح راستہ کیا ہے۔ یہ راستہ تقویٰ کا راستہ ہے جسے سبیلِ شکر کہا جاتا ہے۔ سورۃ یٰسین کے تیسرے رکوع میں اس مضمون کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہے جو انسان کو نیست سے ہست بناتا ہے، اسے لباسِ وجود عطا کرتا ہے، پھر اس کی زندگی کی پرورش، ترقی اور بقا کے اسباب فراہم کرتا ہے، پھر زندگی کی تربیت اور تکمیل کے لئے اسے سازگار اور مناسب ماحول مہیا کرتا ہے۔ رات اور دن کا سلسلہ

قائم کیا گیا، شمس و قمر کو مسخر کیا گیا۔ یہاں ہر چیز اپنی مقررہ نہج پر اپنے رَب کے حضور سجدہ کرتی ہوئی چل رہی ہے کہ اِنسانی زندگی کے لئے مناسب ماحول اور ضروری اسباب مہیّا ہوں۔ کائنات اور اس کا نظام کس نہج پر چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِنسان کو کِس مقام سے نوازا ہے' اس کے لئے سمندر میں سواریاں فراہم کی ہیں اور دوسرے واسطوں میں سواریاں کی فراہمی کی بشارت دی ہے اور یہ سارا نظام جو اس قدر منظم اور مرتب اور متوازن ہے بہت کمزور بنیاد پر قائم ہے' یہ نقش بر آب کی طرح ہے اس کی مثال اس کشتی کی سی ہے جو پانی پر چل رہی ہے مگر کسی وقت بھی ڈوب سکتی ہے ایسی کمزور بُنیاد پر اس زبردست نظام حیات و کائنات کا باقی رہنا اللہ تعالیٰ کی وہ زبردست رحمت اور کرم ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ان آیات پر غور کر کے اپنے رَب کو پہچانے' اَپنے رَب کے انعامات میں گھرا ہوا ہو کر اپنے رب کا حق الوسع شکر ادا کرے۔ اور جو مقام اللہ تعالےٰ نے اس کو دیا ہے اس کی ذمہ داریاں پوری کرے اور تقویٰ اختیار کرے' اور تقویٰ نام ہے انسان کا بہ حیثیت اِنسان کے اپنے مقام کی ذمہ داریاں پُوری کرنے کا۔

اس آیت کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل نکات کو ذہن کو رکھنا مُناسب ہے۔

مُلْکٌ :۔ تصرف۔ اقتدار۔ اتھارٹی۔ قدرت۔

مَلِکٌ :۔ وہ شخص جو لوگوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ جس کو اقتدار حاصل ہو۔

مَلِکٌ لفظ اِنسانوں کے انتظام و اقتدار کے لئے مخصوص ہے مَلِکُ النَّاس کہتے ہیں۔ مَلِکُ الاشیاء نہیں کہتے۔ مَلِکٌ فرد کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ اور پوری قوم کے لئے بھی استعمال ہُوا ہے۔ بنی اسرائیل کے لئے ارشاد ہے:
" اس نے تم میں پیغمبر پیدا کئے اور تمہیں مَلِکٌ بنایا " اور آلِ ابراہیم کے لئے ارشاد ہوا " أٰتَیْنٰهُم مُّلْکًا " ہم نے آلِ ابراہیم کو عظیم ملک بخشا، گویا انبیاء اللہ

کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں اور مُلکی اقتدار قوم کو عطا ہوتا ہے۔ گویا وہ قوم اپنے معاملات فیصل کرنے میں خود مختارِ کُل ہے۔ اور جو فرد اس قوم کا حاکم ہے وہ قوم کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ذمّہ دار ہے۔ اور حقیقت میں تو مَلِکُ النّاس اللہ تعالیٰ ہے کہ فرد اور قوم سَب اس سامنے ذمّہ دار ہیں اور اس کے امر و مشیت کے تابع ہیں۔

مِلْک :۔ جنس یا جائیداد۔

مالک :۔ جنس اور اشیاء پر پُورا تصرّف رکھنے والا ہوتا ہے۔ انسانوں کا مالک انسان نہیں ہوتا اور حقیقت ہی مالک الملک یعنی ہر طرح کے اقتدار پر پُورا تصرّف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ انسان پر تصرّف یا اقتدار اس کے دل پر محبت یا حق کے ذریعہ اور جسم پر طاقت کے ذریعے قائم ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ جس ملک انعام کرتا ہے اس کو لوگوں کے دلوں پر حکومت بخشتا ہے اور سلطنت بھی دیتا ہے۔ محض طاقت کے بل بوتے پر اقتدار حاصل کرنا ظلم اور غصب ہے۔ یہ اس کی مشیّت ہے اور اس کا علم ہے۔ انسان خدا کا کُھلا ہوا دشمن "خَصِیمٌ مُّبِینٌ" بھی ہو سکتا ہے' ہر غاصب اپنے ظلم کے جواز میں دلیل یہی پیش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مُلک عطا کیا ہے۔ اس کی انعام کی ہوئی عزّت بھی وہ ہے جس میں سر کے ساتھ دل بھی جُھکتے ہیں محض سر خوف کی وجہ سے نہیں جُھکتے۔

اور اللہ تعالیٰ جس کو مُلک یا مِلک تفویض فرماتا ہے، مَلِک یا مالِک بناتا ہے اس پر کچھ شرائط عائد کرتا ہے جن کی خلاف ورزی ظلم ہے۔

اس تمام گفتگو کے بعد اب ہم لفظِ مالک کے مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہر شے کا مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے وہ کچھ شرائط اور قواعد کے تحت جس حد تک مُناسب سمجھتا افراد کو اشیاء کا مالک بنا دیتا ہے اس نے چوپایوں کو انسانوں کے لئے خلق کیا

اس لئے اِنسانوں کو ان کا مالک بنایا۔ لیکن اس ملکیت کے کچھ شرائط ہیں، اور ان شرائط کو پورا کرنے ہی سے اس ملکیت کا جواز اور استحقاق قائم ہوتا ہے' جانوروں کو انسانوں کے فائدے کے لئے بنایا گیا ہے' جانوروں کے ساتھ انسان کا تعلق یہ ہے کہ وہ ان سے غذا حاصل کرتا ہے' انہیں سواریوں کے طور پر استعمال کرتا ہے' پینے کے لئے دودھ حاصل کرتا ہے اور بھی بے شمار فائدے ہیں جو جانوروں کے گوشت، پوست اور بالوں سے حاصل کئے جاسکتے ہیں' لیکن چونکہ انہیں اللہ نے خلق کیا ہے اور ان کا حقیقی مالک بھی وہی ہے اس لئے ان سے اِنسانوں کا تعلق حُرمت اور عزّت کا تعلق ہے۔ یہ حسنِ سلوک کے مستحق ہیں۔ انہیں اذیّت دینے یا قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ محض تفریحاً شکار کھیل کر ان کو ہلاک کرنا جائز نہیں ہے۔ نہ ان کی نسل کشی کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے' اس لئے کہ جس چیز کو انسان نے خلق نہیں کیا انسان اسکو مارنے کا حق نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ نے وجود کے جو مراتب بنائے ہیں ان میں جانوروں کا ایک خاص درجہ ہے ان کو مٹانے یا ختم کرنے کی کوشش پورے منصوبۂ تخلیق میں خلل اندازی کرنے کے مترادف ہے۔ انسان کو صرف اس حد تک اجازت ہے کہ اگر چوپائے اسے یا اس کی ملکیت کو نقصان پہنچائیں تو ان سے اپنا تحفّظ کرے ورنہ اسے ان کو قتل کرنے یا ان کی نسل کو ختم کرنے کی اجازت نہیں ہے ان چوپایوں کو اللہ تعالیٰ نے خلق کیا ہے' انہیں انسان کے لئے خلق کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان کا مالک بنایا ہے تاکہ وہ ان سے فائدے اُٹھا سکے اور اللہ تعالیٰ کے انعامات پر تفکّر کرکے اپنے رب کا شکر ادا کرے۔ مگر انسان جسے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوق بنایا ہے اور جسے دیگر موجودات پر تفوق اور نصرت عطا کیا ہے اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرکے خود اپنی تحقیر کرتا ہے اور ان چیزوں سے جو مراتبِ وجود میں اس سے پست ہیں نصرت کی توقع باندھتا ہے۔

واضح رہے کہ انسان کا جانوروں کو سدھانا، انہیں خود سے مانوس کرنا، انہیں سواری اور دوسرے کاموں میں استعمال کرنا انسان کی تہذیبی ترقی میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے جانوروں کو انسان کے لئے مسخر کر دیا۔ انسانی زندگی کا ابتدائی دَور وہ تھا جب وہ جانوروں کا صرف شکار کر سکتا تھا مگر جب انسان نے جانوروں کو سدھانا اور ان سے کام لینا سیکھ لیا تو انسانی تہذیب شکار کے دَور سے نکل کر گلّہ بانی اور پھر زراعت کے دَور میں داخل ہو گئی۔

وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ ﴿٧٤﴾ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُندٌ مُّحْضَرُونَ ﴿٧٥﴾

"اور انہوں نے (انسانوں) اللہ کو چھوڑ کر دوسرے الٰہ بنا لئے کہ شاید وہ ان کی مدد کر سکیں مگر وہ ان کی نصرت کی استطاعت نہیں رکھتے اور انسان ان (جھوٹے الٰہوں) کا لشکر بن کر اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے۔"

اس آیۂ مبارکہ میں سب سے پہلی بات جو غور طلب ہے وہ یہ کہ اللہ کو چھوڑ کر جو حقیقی خالق اور مالک اور رب اور معبود ہے وہ کون سے جھوٹے الٰہ ہیں جنھیں انسان اپنا معبود بنا لیتا ہے؟ ایسے جھوٹے معبودوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ وہ شجر اور حجر کے بُت ہو سکتے ہیں، سماج کے بُت ہو سکتے ہیں، اجنّہ یا ملائکہ ہو سکتے ہیں۔ مذہب کے ٹھیکیدار ہو سکتے ہیں اور وہ خود انسان کے اپنے نفس کے بُت بھی ہو سکتے ہیں۔

سماج کے بتوں کی تین بڑی قسمیں ہیں۔ اقتدار کے بُت جن کی علامت فرعون ہے، دولت کے بُت جن کی علامت قارون ہے اور وہ بُت جو سماج کے مذہبی اور روحانی ٹھیکیدار بن جاتے ہیں۔ یہ خارجی بُت ہیں اور داخلی بُت وہ ہیں جو انسان کے اپنے نفس کے اندر ہوتے ہیں جو اس کی خواہشات، شہوات، لذات، غصّہ، حسد اور تکبّر وغیرہ کے بُت ہیں۔ یہ تمام وہ جھوٹے الٰہ ہیں، جنھیں انسان اللہ کو چھوڑ کر اپنا

معبود بنالیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مراتب وجود میں سب سے بلند مرتبہ پر رکھا ہے، اسے خود آگاہی کی دولت سے نوازا ہے، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ انسان اپنے مرتبہ اور مقام کا احترام کرتا اور اپنے رب کا شکر ادا کرتا، مگر انسان شکر کے بدلے کفر کا راستہ اختیار کرتا ہے اور اللہ کو چھوڑ کر جھوٹے الہوں کو اپنا معبود بنالیتا ہے۔ گو کہ اشرف المخلوقات ہونے کی بنا پر اللہ کی مخلوق پر شفقت اور اللہ کی اطاعت اس پر واجب ہو جاتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ الٰہ بنانے کے معنی کیا ہیں اور الٰہ بنانے کے ساتھ کس قسم کے تصورات وابستہ ہیں، ہر انسان کی زندگی میں کوئی قدرِ اعلیٰ ہوتی ہے جو اس کی تمام زندگی پر محیط اور اثر انداز ہوتی ہے اسی قدرِ اعلیٰ کو الٰہ کہتے ہیں اگر کسی انسان کی زندگی کا سب سے بڑی قدر دولت یا اقتدار ہے تو وہی اس کا الٰہ ہے۔ گویا الٰہ کے معنی ہیں زندگی کی وہ قدرِ اعلیٰ جو زندگی کا مقصد یا ہدف مقرر کرتی ہے اور چونکہ انسان اپنی تمام توانائیاں اور سرگرمیاں اسی مقصد کے حصول کے لئے وقف کرتا ہے اس لئے یہ قدرِ اعلیٰ اس کی تمام زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔

اللہ کی عبادت کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ حق، خیر اور حسن کو زندگی کی قدرِ اعلیٰ سمجھا جائے جس نے اس مقصدِ اصلی اور حقیقی سے انحراف کر کے دوسرے مقاصد کو اپنایا اور دولت، اقتدار یا کسی اور مقصد کو اپنی زندگی کی قدرِ اعلیٰ بنالیا تو اس نے من دون اللہ الٰہ بنالئے اور اس کو جانچنے کا پیمانہ یہ ہے کہ جو اللہ کی راہ میں اپنی جان، مال، اولاد اور دنیوی عزت اور شہرت کو قربان کر سکتا ہے وہ اللہ کی عبادت کرتا ہے اس کے برعکس جو دولت، طاقت، اقتدار یا کسی اور مقصد کے لئے اپنا نفس و ضمیر اور اپنا دین و ایمان بیچ سکتا ہے تو وہ انہی کا پجاری ہے اس نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے الٰہ بنا لئے ہیں۔ اس کی زندگی کا مقصد دولت یا طاقت

کا حصول ہے اور وہ اس مقصد کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔

اِلٰہ کے ساتھ جو تصوّرات قائم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ انسان کا اِلٰہ وہ ہے جو اس کی زندگی کی قدرِ اعلیٰ ہے یہی قدرِ اعلیٰ زندگی کا مقصد مُتعیّن کرتی ہے اور انسان اپنی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں اسی مقصد کے لئے وقف کر دیتا ہے بالفاظِ دیگر وہ اپنے آپ کو اس مقصد کے سُپرد کر دیتا ہے یہ تسلیم کی منزل ہے پھر انسان اسی کی رضا کے لئے سعی کرتا ہے اسی کو قادرِ مطلق سمجھتا ہے اسی کو اپنی اُمید و بیم کا مرجع اور اس لحاظ سے اپنی تمام تعظیم و اطاعت کا مرکز قرار دیتا ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر جھوٹے الٰہوں کو معبود بنانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان حق، خیر اور حُسن کے علاوہ کسی اور شے کو اپنی زندگی کی قدرِ اعلیٰ سمجھتا ہے، اس نے زندگی کے حقیقی مقصد سے انحراف کر لیا ہے اس لحاظ سے اس کی زندگی کا رُخ غلط ہو گیا ہے، اس کی کامیابی اور ناکامی کا پیمانہ بدل گیا ہے اور وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جھوٹے الٰہوں سے نصرت کی غلط توقعات باندھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرد ہے الوہیت میں، عبادت میں، توجّہ اور اعتماد میں اور اطاعت و تعظیم میں، اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے الٰہوں کو معبود بنانے کا مطلب انہیں الوہیت، عبادت، توجّہ، اعتماد اور اطاعت و تعظیم کا مرجع اور مرکز قرار دینا ہے۔

ارباب من دون اللہ کی نصرت کے ذیل میں ایک ضمنی مگر اہم مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے، آج کل یہ بحث بہت شدومد کے ساتھ جاری ہے کہ کسی اور کو پکارنا جائز ہے یا نہیں۔ بہت سے لوگ اس معاملہ میں اس قدر شدّت پر اُتر آتے ہیں کہ ان کے نزدیک پیمبر اور ولی کو پکارنا بالفاظِ دیگر یا محمدؐ اور یا علیؑ کہنا تک جائز نہیں ہے، یہ بڑا حساس اور نازک مسئلہ ہے اور اس سے بہت سی اُلجھنیں پیدا ہوتی ہیں اس لئے اس معاملہ کو نہایت احتیاط اور وضاحت سے سمجھنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے واحد صحیح راستہ یہ ہے کہ خود کلام پاک کی آیات سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کی جائے۔

جہاں تک اللہ کے علاوہ کسی کو رب یا اِلٰہ بنانے کا تعلق ہے اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، یہ کوئی متنازعہ موضوع نہیں ہے جس پر بحث کی جائے، جو لوگ یا محمدؐ اور یا علیؑ کہتے ہیں وہ ان ہستیوں کو خدا سمجھ کر نہیں پکارتے بلکہ خدا کا بندہ اور اس کا ولی سمجھ کر پکارتے ہیں۔

اب جہاں تک اولیاء سے نصرت طلب کرنے کا تعلق ہے اس سلسلے میں کلام پاک میں بعض آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمہارا اللہ کے سوا نہ کوئی ولی ہے اور نہ نصیر، اور یہ کہ جن کو تم مِن دُونِ اللہ پکارتے ہو تو وہ خود تمہاری طرح کے بندے ہیں اور یہ کہ انہوں نے کوئی شے خلق نہیں کی بلکہ خود مخلوق ہیں وہ اموات ہیں، غیر احیاء ہیں اور یہ کہ وہ تمہارے فائدے یا نقصان پر کسی طرح کی کوئی قدرت نہیں رکھتے۔ اس کے ساتھ ہی کلام پاک کی دیگر آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ تمہارا ولی اللہ ہے اور رسول ہے اور وہ صاحبانِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔ ایک موقع پر یہ کہا گیا ہے کہ مومنوں میں سے بعض بعض کے ولی ہیں، ایک اور آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے رسول اور مومنین کے علاوہ کسی اور کو اپنا ولی نہ بناؤ۔

ان مختلف اور بظاہر متضاد آیات کو اپنے سامنے رکھ کر اس مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ دُنیا میں انسانوں کے دو گروہ ہیں ایک حزب اللہ اور دوسرا حزب من دون اللہ یا حزب الشیطان اور جو حزب اللہ میں شامل ہو گیا وہ اللہ تعالیٰ کی فوج کا لشکری ہے، حزب اللہ کی شان یہ ہے کہ اس کا جسم لشکری ہیں مگر اس کی رُوح خود اللہ تعالیٰ ہے اور ہر لشکر کے جسم میں اس کے بادشاہ کی رُوح کارفرما ہوتی ہے، اس مضمون کو مولانا جلال الدین رومی نے اپنی مثنوی کے پانچویں دفتر میں اس طرح بیان فرمایا ہے ؎

پس بود اجسام ہر لشکر ز شاہ زاں زنندے تیغ بر اعدائے شاہ

تو بخشم شہ زنی آں تیغ را ورنہ بر اخواں چہ خشم آید ترا

ہر لشکری کا جسم بادشاہ سے پُر ہوتا ہے جبھی تو وہ اعدائے شاہ کے خلاف قتال کرتا ہے، اس کا غصّہ اس کے بادشاہ کا غصّہ ہوتا ہے ورنہ وہ جن لوگوں سے جنگ کرتا ہے ان سے اس کی ذاتی دشمنی یا خصومت نہیں ہوتی، اس مضمون کی وضاحت ایک اور حکایت سے ہوتی ہے جو اسی مثنوی میں ایک دوسرے موقعہ پر بیان کی گئی ہے اور وہ حکایت یہ ہے کہ ایک جنگ میں حضرت علیؓ نے ایک پہلوان کو زیر کر لیا اور چاہتے تھے کہ اسے قتل کر دیں کہ اس نے آپ کے روئے مُبارک پر اپنا لعاب دہن پھینک دیا۔ اس موقعہ پر مولانا روم فرماتے ہیں ؎

او خیو انداخت بر روئے علیؓ افتخارِ ہر نبی و ہر ولی

پہلوان کی اس ناشائستہ حرکت پر حضرت علیؓ اس کے سینے سے اُتر آئے اور جب پہلوان نے حیرت اور سراسیمگی کے عالم میں آپؓ سے اس رویّہ کی وضاحت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ تیری نازیبا حرکت سے مجھے غصّہ آ گیا اور میں تجھے اس حالت میں قتل نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میرے اس عمل میں میرا اپنا نفس اور اس کا اشتعال شامل ہو جائے پھر جب پہلوان نے آپؓ سے کہا کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اب کے مقابلہ میں آپ غالب ہوں گے یا مغلوب تو آپؓ نے فرمایا کہ میں اس بارے میں فکرمند نہیں ہوں اس لئے میری جنگ میری اپنی جنگ نہیں ہے بلکہ میں اللہ کے لئے جنگ کر رہا ہوں اس لئے اس لڑائی کے نتیجہ کے بارے میں فکر کرنا میرا کام نہیں ہے میں جس کی جنگ لڑ رہا ہوں وہ خوب جانتا ہے کہ اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ مقصد یہ کہ حزب اللہ کے لشکری کی جنگ اللہ کی جنگ ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ہر لشکر کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ پُر بود اجسام ہر لشکر ز شاہ اسی طرح ہم حزب اللہ کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس لشکر کا ہر سپاہی بقدرِ مرتبہ اللہ تعالیٰ کی

ولایت اور نصرت کا امین ہے اور کلام پاک میں اس کی سند یہ ہے کہ اللہ نے اپنے ساتھ رسول اور مومنین کو ولی قرار دیا ہے۔ اس اعتبار سے اللہ کے رسول اور اس کے ولی کو پکارنا "من دون اللہ" کو پکارنے کے مترادف ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا جبکہ وہ بقدر ظرف اور مرتبہ اللہ تعالیٰ کی نصرت ہے۔

"من دون اللہ" جن لوگوں کو پکارا جاتا ہے ان کے بارے میں جو ایک خاص بات کہی گئی ہے وہ یہ کہ یہ اموات ہیں، غیر احیاء ہیں، مگر جہاں تک شہداء کا تعلق ہے ان کی زندگی کی ضمانت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے، درحقیقت حیاتِ دُنیا میں جب ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ حیاتِ طیبہ پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس پر موت طاری نہیں ہوتی، ان لوگوں کو جو زندہ ہیں اور جن کی زندگی کی بشارت اور ضمانت خود اللہ نے دی ہے من دون اللہ معبودوں کے زمرے میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

اسی طرح وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں نازل کرتا ہے وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں اور ان چاروں گروہوں میں مشترک صفت ان کا صالحین ہونا ہے گویا انبیاء ہوں یا صدیقین اور شہداء یہ سب صالحین ہیں۔ ہم اپنی نماز میں ان کو سلام کرتے ہیں، پہلے ہم حزب اللہ کے سید و سردار یعنی نبی پر سلام کرتے ہیں اور پھر صالحین کی اس جماعت پر سلام کرتے ہیں کہ جن میں انبیاء، صدیقین اور شہداء شامل ہیں۔ یہ لوگ مُردہ نہیں بلکہ زندہ ہیں اس لئے کہ مردوں پر سلام نہیں کیا جاتا۔ اور یہ وہ صحبت یا سنگت ہے جو زمان اور مکان کی قید سے ماوراء ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے تمام صالح بندے شامل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی زندگی موت کی دستبرد سے بلند ہے اور پھر یہ کہ ان کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ انسانوں کے نفع اور نقصان پر قادر نہیں ہیں اس لئے کہ ان کے ذریعہ لوگوں کو ایمان کی دولت ملتی ہے۔ البتہ یہ قدرت اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اذن سے موثر ہوتی ہے۔ یہ لوگوں

کو ظلمت سے نور کی طرف لے جانے والے ہیں اور کسی انسان کے لئے ایمان سے بڑھ کر فائدہ کی کوئی اور صورت کیا ہو سکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے یہ صالح بندے حزب اللہ کے لشکری ہیں اس لئے اس کی ولایت اور نصرت کے امین ہیں۔ یہ اموات اور غیر احیاء نہیں ہیں اس لئے ارباب من دون اللہ میں ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا اور یہ جیسیں ایمان کی روشنی عطا کرنے والے ہیں جس سے بڑھ کر کوئی اور فائدہ نہیں ہو سکتا اس لئے ان کو پکارنا ارباب من دون اللہ سے نصرت طلب کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی نصرت اللہ کی مدد اور نصرت ہے۔

نصر کا مفہوم

اب ہم لفظ نصر کے معنوں کو مطالعہ کریں گے۔ النصر یا نصر یا نصرت کے معنی ہیں مدد خاص طور پر کسی مشکل موقع جیسے دشمن کے مقابلے میں غالب آنے میں مدد کرنا۔ ناصر اسم فاعل ہے اور نصیر اسم صفت ہے، کلام پاک میں النصیر کا لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لئے استعمال نہیں ہوا، اللہ کے علاوہ کسی میں نصرت کی استطاعت نہیں ہے، جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں سعی کرتے ہیں اللہ ان کی نصرت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے کاز (CAUSE) میں اپنے بندوں سے نصرت طلب کرتا ہے، ایمان لانے والوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ انصار اللہ بن جائیں، اللہ کی راہ میں جہاد اس کے کاز میں نصرت کرنا ہے اور جو اللہ کی نصرت کرتے ہیں اللہ ان کی نصرت کرتا ہے یہ دونوں باتیں ساتھ چلتی ہیں کسی ایسے شخص کی نصرت کرنا جو اللہ کی راہ میں جہاد کر رہا ہو درحقیقت اللہ کی نصرت کرنا ہے۔ اس لحاظ سے اللہ کے رسول کی نصرت اللہ کی نصرت ہے اور میدان کربلا میں امام حسینؑ کا ہمیشہ جاری رہنے والا استغاثہ اللہ کی راہ میں نصرت کی طلب ہے اور اس استغاثہ پر لبیک کہنا اللہ کی نصرت کرنا ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جھوٹے الہٰوں کو اپنا معبود بنا لیتے ہیں وہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ یہ جھوٹے الٰہ ان کے مذموم مقاصد کے حصول میں ان کی مدد کر سکتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ان معاملات میں بھی جن کی وجہ سے ان کو الٰہ بنایا جاتا ہے مثلاً" دولت، طاقت، شہرت، عزت وغیرہ کا حصول انسان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے اس لئے کہ ان میں یہ استطاعت ہی نہیں ہے کہ کسی کی نصرت کر سکیں۔ اس دُنیا کے نظام پر اللہ تعالیٰ کی مشیت غالب ہے اور جھوٹے الٰہ خود محتاج ہیں اور جس حد تک وہ کسی کی مدد کر سکتے ہیں وہ بھی اللہ کی مشیت کے تحت ہے۔ اس کے اذن کے بغیر کسی کو کچھ نہیں مل سکتا۔ وہ لوگ جو جھوٹے الہٰوں سے نصرت کی توقع رکھتے ہیں وہ محض غلط فہمی اور گمراہی کا شکار ہیں۔ وہ ان جھوٹے معبودوں کی پرستش کر کے اپنے مرتبہ اور مقام کی تحقیر کرتے ہیں، وہ بجائے حزب اللہ کے حزب الشیطان میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا اور آخرت دونوں میں نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ یہ خسران مبین کا شکار ہیں۔ جھوٹے الہٰوں کی پرستش سے انہیں خود تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا البتہ یہ ان کے لشکری بن کر ان کی اطاعت کرتے ہیں اور ان کے ظلم و جور کو تقویت پہنچاتے ہیں، مگر انہیں اللہ تعالیٰ کے حضور ہی حاضر ہونا ہے۔ یہ اس حضوری سے فرار حاصل نہیں کر سکتے، لیکن یہ بجائے اس کے کہ اللہ کے سامنے حزب اللہ میں شامل ہو کر حاضر ہوتے اب یہ حزب الشیطان کے لشکری کی حیثیت سے حاضر ہوں گے، اور یہ اس لئے کہ انہوں نے خود اللہ کو چھوڑ کر جھوٹے الہٰوں کو اپنا رب بنا لیا ہے۔

فَلَا يَحْزُنكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٧٦﴾

"پس ان کا قول تمہیں محزون نہ کرے، اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔"

اب تک جو مضمون بیان کیا گیا اس میں دُنیا کی کیفیت اور اس میں انسان کے مرتبہ و

مقام پر روشنی ڈالی گئی ہے. اللہ تعالیٰ نے انسان کو مراتبِ وجود میں سب سے بلند درجہ پر رکھا ہے دوسری مخلوقات کو اس کا مطیع بنایا ہے اور کائنات کی ہر شے کو اس کے لیے مسخر کیا ہے اس مرتبہ اور مقام کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور حزب اللہ کا لشکری بن جائے، مگر انسان کا دل بے یقینی کا شکار اور طرح طرح کے وسوسوں اور خوف کی آماجگاہ ہے وہ ارباب من دون اللہ کی اطاعت کرنے لگتا ہے اور ان سے نصرت اور مدد کی توقع باندھتا ہے. یہ جھوٹے الٰہ اس کی نصرت نہیں کر سکتے مگر انسان ان کی اطاعت کر کے حزب الشیطان میں شامل ہو جاتا ہے وہ اپنی طاقت، دولت اور کثرت پر گھمنڈ کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کر کے اس کے رسولوں کا مذاق اڑاتا ہے۔

زیرِ مطالعہ آیت میں خطاب حزب اللہ کے سید و سردار سے ہے اور کہ تم ان کی باتوں پر حزن نہ کرو اور یہ حزن ایک ایسے شخص کا حزن ہے جو لوگوں کو آگ کے گڑھے میں گرنے سے روکنا چاہتا ہے مگر لوگ اس کی بات نہیں سنتے بلکہ اس کا استہزا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ سے خطاب کر رہا ہے کہ حزب الشیطان اور حزب اللہ کا یہ تصادم تو جاری رہے گا مگر تم حزب الشیطان کی ظاہری شان و شوکت، مال و دولت اور تعداد کی کثرت اور لوگوں کے ذہن و عمل پر ان کے اثر و نفوذ کو دیکھ کر کوئی ملال نہ کرو اس لیے کہ عباد اللہ کا ولی اور نصیر اللہ تعالیٰ اور حزب الشیطان کے لوگ جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اس سے اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے، یہ جو کچھ ظاہر کرتے ہیں وہ ان کی ظاہری شان و شوکت، دولت، طاقت اور تعداد کی کثرت ہے اور جو کچھ یہ لوگ چھپاتے ہیں وہ ان کے دل کے خوف اور اندیشے ہیں۔ آج کے دور کے انسان کی یہی حالت ہے. ظاہر میں اپنی مادی ترقی، دولت اور طاقت کی کثرت کی نمائش ہے، باطن میں وہ داخلی انتشار اور اضطراب کا شکار ہے اور خوف اور مایوسی کی دلدل میں دھنستا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو اسی طرف متوجہ کر رہا ہے کہ اے حزب اللہ کے سید و سردار

تم حزب الشیطان کے ظاہری طمطراق اور ان کے اثر و اقتدار سے محزون نہ ہو یہ باطنی طور پر سخت اضطراب اور مایوسی کا شکار ہیں اس لئے کہ جن جھوٹے معبودوں سے یہ نصرت کی توقع باندھتے ہیں وہ ان کی نصرت کی ہرگز استطاعت نہیں رکھتے اس کے برعکس حزب اللہ کو وہ اطمینان حاصل ہے جسے سکینۃ القلب کہتے ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ تعداد اور وسائل کی قلت کا شکار ہیں مگر انہیں اللہ کی نصرت حاصل ہے اور انہیں اس بات کا یقین ہے کہ اللہ اپنے دشمنوں کے ظاہر اور باطن سے واقف اور کافروں پر محیط ہے۔ حزب اللہ کی تقویت اور اطمینان کے لئے یہ یقین کافی ہے کہ اللہ ہر بات کو دیکھ رہا ہے اور ہر بات پر قادر ہے۔

سورۃ مبارکہ یٰسین کے پانچویں رکوع کی جن آیات کا اب تک ہم نے مطالعہ کیا ہے ان میں جو مضامین بیان کئے گئے ہیں ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

مضامین کے پہلے حصہ میں جو نکات بیان کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔

(ا) دنیا میں انسان کی زندگی کا قوس: انسان ضعف کی حالت میں پیدا ہوتا ہے پھر وہ رفتہ رفتہ طاقت اور قوت حاصل کرتا ہے پھر ایک نکتۂ عروج پر پہنچ کر یہ قوس زوال اور انحطاط کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

(ii) اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا نظام: ہدایت کے دو ستون ہیں، رسولؐ اور کتاب، کتاب ذکر اور قرآن مبین ہے جسے قلبِ رسولؐ پر نازل کیا جاتا ہے اور ہدایت کا مقصد زندوں کو مُردوں سے الگ کرنا ہے، جن کے قلب زندہ ہیں وہ ہدایت سے فیضیاب ہوتے ہیں اور حیاتِ طیبہ حاصل کرتے ہیں، اس کے برعکس جن کے قلوب مُردہ ہیں وہ ہدایت کا انکار کر کے خود پر حجتِ عذاب کو تمام کر لیتے ہیں۔

مضامین کے دوسرے حصہ میں جن نکات پر روشنی ڈالی گئی وہ یہ ہیں۔

(i) کائنات میں انسان کا مرتبہ اور مقام: اللہ تعالیٰ نے انسان کو مراتبِ وجود میں

سب سے اونچے درجے پر رکھا ہے، دیگر مخلوقات کو اس کا تابع بنایا ہے اور اسے ہر شے پر اقتدار اور تصرّف عطا کیا ہے۔

(ii) انسان کی گمراہی: انسان اپنے بلند مرتبہ اور مقام کا احترام نہیں کرتا اور بجائے اللہ کی عبادت کرنے کے بتانِ آزری کے سامنے اپنے سر جھکاتا ہے اور ان سے نصرت کی توقع رکھتا ہے۔ وہ اس بات کا شعور نہیں رکھتا کہ اس کائنات کی ہر شے اللہ کے حکم کے تابع ہے، مومن اس حکم کو برضا و رغبت قبول کرتا ہے لیکن کافر کو بہ جبر و اکراہ اس حکم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے، کافر اللہ کے حکم کا انکار کر کے 'جند الشیطان' میں شامل ہو جاتا ہے مگر اس کے باوجود اللہ کے سامنے حاضر ہونے سے بچ نہیں ہو سکتا۔

اب ہم جن آیات کا مطالعہ کریں گے ان کا مضمون بعثت یا حیات بعد الموت سے شروع ہوتا ہے جس کا تعلق دین کے ایک بنیادی اصول یعنی قیامت سے ہے۔

سورۃ یٰسٓ۔ قلب قرآن

اب تک ہم نے سورۃ یٰسین کا جو مطالعہ کیا ہے اس کی روشنی میں ہم یہ آگاہی حاصل کر سکتے ہیں کہ ان مضامین میں جن نکات کو اجاگر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں: اللہ تعالیٰ کی وحدانیت یعنی توحید، اللہ تعالیٰ کا بندوں سے تعلق یعنی عدل۔ اللہ تعالیٰ کی انسانوں پر سب سے عظیم رحمت یعنی ہدایت کے قبول یا رد کرنے کے نتیجہ میں جزا اور سزا کا قانون بالفاظ دیگر اس سورۃ کے مضامین میں دین کے تمام بنیادی اصول۔ توحید، عدل، نبوّت، امامت اور قیامت۔ یکجا سموئے ہوئے ہیں' اور چونکہ کلام پاک کے تمام مضامین انہی اصولوں کے ابلاغ، توجیہ، تشریح اور تفسیر پر مشتمل ہیں اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے سورۃ یٰسین میں کلام پاک کے تمام مضامین اور موضوعات اسی طرح سمایا ہے جیسے انسان کے جسم میں دل دھڑکتا ہے اور اسی لئے اس سورۃ مبارکہ کو قرآن حکیم کا قلب یعنی دل کہا جاتا ہے۔

اس سے قبل یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ سورۃ یٰسین میں جو مضامین پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے رکوع میں بیان کئے گئے ہیں پانچویں رکوع میں ان تمام مضامین کا خلاصہ اور ان کی تکمیل کی گئی ہے مگر یہاں تمام مضامین کو ایک نسبتاً مختلف اور بلند سطح پر پیش کیا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ مختلف اور بلند سطح کیا ہے؟ اس سطح کی نشاندہی اس رکوع کے تیسرے حصے میں کی گئی ہے جو مندرجہ ذیل آیات پر مشتمل ہے۔

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ﴿٧٧﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ﴿٧٨﴾ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿٧٩﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ ﴿٨٠﴾ أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يَخْلُقَ مِثْلَهُم ۚ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ﴿٨١﴾ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَن يَقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾ فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٣﴾

(کیا انسان یہ نہیں دیکھتا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا پھر وہ ہم سے ظاہر بہ ظاہر جھگڑنے والا بن گیا، اور ہمارے لئے مثالیں گھڑنے لگا اور اپنی خلقت کو بھول گیا۔ کہتا ہے کہ جب ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی تو ان کو کون زندہ کرے گا۔ کہہ دو تم کو وہی زندہ کرے گا جس نے تم کو پہلی مرتبہ خلق کیا تھا اور وہ ہر مخلوق کا جاننے والا ہے۔ وہ وہی ہے جس نے تمہارے لئے ہرے درخت سے آگ پیدا کی۔ پھر تم اس سے اور آگ سلگا لیتے ہو۔ کیا وہ جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان کی مثل دوبارہ پیدا کرے۔ بیشک (وہ ضرور قادر ہے) وہ تمام علم رکھنے والا الخلاق

ہے۔ اس کی شان تو یہ ہے کہ جب کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے کہ "ہو جا" پس وہ ہو جاتی ہے۔ پس وہ ذات ہر نقص سے منزّہ ہے جس کے ہاتھ میں ہر شے کی ملکوت ہے اور تم اس ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے)۔

ان آیات پر غور اور توجہ سے نگاہ کی جائے تو ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ اب تک جو مضامین بیان کئے گئے ان میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو نمایاں کیا گیا تھا جو اللہ کے بندوں سے تعلق کو ظاہر کرتی ہیں یعنی ہدایت، رحمت، ربوبیت اور عدل کی صفات اور یہ وہ صفات ہیں جنہیں صفاتِ فعلی کہا جاتا ہے۔

اب گفتگو جس سطح پر پہنچ رہی ہے وہ نسبتاً بلند سطح ہے، یہاں صفاتِ فعلی کا ذکر نہیں ہے بلکہ اب اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت کا ذکر کیا جارہا ہے جو اس کی صفاتِ ذات ہیں اور قدرت اور علم ہی وہ صفات ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ تمام کائنات پر محیط ہے۔

اب تک جو ذکر ہو رہا تھا ان میں صفاتِ فعل یعنی ہدایت، رحمت، ربوبیت اور عدل کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا تھا البتہ صفاتِ ذات یعنی علم اور قدرت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا۔ انا نحن نحی الموتٰی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف اشارہ ہے اور و نکتب ما قدموا و اٰثارھم وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ ۝ اس کے علم کی شان کو ظاہر کرتا ہے، گویا علم اور قدرت کا ذکر موجود ہے مگر ایک زیریں رو (UNDERCURRENT) کے طور پر نمایاں طور پر جن صفات کا ذکر ہے وہ صفات فعل ہیں۔

اب اس سورۃ کے مضامین میں وہ موڑ آگیا ہے جہاں روئے سخن صفاتِ فعل سے صفاتِ ذات کی طرف رجوع کر رہا ہے یا یُوں کہہ سکتے ہیں کہ اب گفتگو عالمِ خلق سے عالمِ اَمر کی طرف یا مُلک سے ملکوت کی طرف منعطف ہو رہی ہے، اب ہدایت،

رحمت، ربوبیت اور عدل کی شان نمایاں نہیں کی جارہی بلکہ اب قدرت اور علم کی شان کو نمایاں کیا جارہا ہے۔ اب گفتگو صفاتِ فعل سے صفاتِ ذات کی طرف رجوع کر رہی ہے، اور یہ وہ بلندی ہے جس سے زیادہ اونچی اور کوئی بلندی نہیں ہے۔ اور یہ گفتگو ایک سطح سے دوسری بلند سطح کی طرف کس طرح ترقی کر رہی ہے اس کی وضاحت ان آیات کے مطالعہ سے ہوجاتی ہے جو اب ہمارے زیرِ مطالعہ ہیں۔

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ﴿۷۷﴾ (کیا انسان یہ نہیں دیکھتا کہ ہم نے اسے ایک نطفہ سے خلق کیا۔ پھر وہ ہم سے ظاہر باظاہر جھگڑنے والا بن گیا)

اس آیت میں جس نکتہ کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے وہ خود انسان کی اپنی خلقت ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت سے ہے۔ اسی سورۃ میں دو اور مقامات پر أَلَمْ يَرَوْا (آیت ۳۱) اور أَوَلَمْ يَرَوْا (آیت ۷۱) کے الفاظ کے ساتھ انسان کو خاص طور پر متوجہ کیا گیا ہے، ان میں ایک مقام پر قوموں کے زوال اور فنا کا ذکر ہے اور دوسرے مقام پر یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دیگر مخلوقات کو انسان کے تابع بنایا ہے، گویا پہلے جو بات کہی جارہی تھی وہ یہ کہ انسان قوموں کے عروج و زوال پر غور کر کے اور خود اپنے مرتبہ اور مقام کا شعور حاصل کر کے اپنی اخلاقی اور سماجی ذمہ داریوں کو پورا کرے اور اب جو بات کہی جارہی ہے اس میں خود انسان کی خلقت کا ذکر ہے اب اپنے وجود اور اپنی ذات کی طرف متوجہ کیا جارہا تھا دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ پہلے عالم آفاق کی آیات کی طرف متوجہ کیا جارہا تھا دوسرے لفظوں میں آیات سے عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کی دعوت دی جارہی ہے اور یہ بتایا جارہا ہے کہ انسان جس کی ابتدا نہایت حقیر ہے جو ایک کرمِ ضعیف ہے اس کی تخلیق اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت کی مظہر ہے اور پھر اسے اس قدر آزادی دینا کہ وہ اپنے رب کا خصیم مبین بن

جائے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور بے نیازی کی شان ہے۔

خصیم مبین :-

خصیم کے معنی ہیں جھگڑالو، دشمن اور مبین کا مطلب ہے روشن، ظاہر، واضح غیر مبہم کھلی ہوئی بات مبین کا ایک لفظ اس سورت کے مضامین کو روشن اور واضح کرنے کا قرینہ ہے اس لفظ سے اس کی معنوی فضا اور آہنگ مرتب ہوتا ہے۔ سورۃ لٰیسین میں لفظ مبین سات مواقع پر استعمال ہوا ہے۔

(۱) پہلا موقع وہ ہے جب یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے ہر شے کا احصاء امام مبین میں کر دیا ہے۔ امام مبین سے مراد وہ علم الٰہی ہے جو تمام اشیاء کا احاطہ کئے ہوئے ہے جس میں تمام اشیاء کی تعداد ہی نہیں بلکہ ان کی تقویم و تقدیر کی وضاحت بھی ہے۔ یہ کائنات ایک باقاعدہ اور منظم نظام کے تحت چل رہی ہے جس میں ہر شے کا خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی حساب کیا جا رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے علم کی کتاب مبین ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے علم کے ساتھ تمام کائنات کو محیط کئے ہوئے ہے گویا کائنات کی تمام اشیاء مردہ یا زندہ، اگلی یا پچھلی، انسانوں اور قوموں کے اعمال و کردار، حوادث و واقعات علم الٰہی میں ایک واضح کتاب ہے۔

(۲) لفظِ مبین کے استعمال کا دوسرا موقع وہ ہے جب بستی کی طرف بھیجے جانے والے رسولوں کی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ "وَمَا علینا الا البلاغ المبین۔ بلاغ مبین میں قول اور عمل دونوں شامل ہیں۔ اللہ کا کلام بھی بلاغ مبین ہے اور اسوۂ رسول بھی بلاغ مبین ہے۔

(۳) تیسرا موقع وہ ہے جب مومنِ آلِ یٰسین کی زبان سے یہ الفاظ بیان کئے گئے ہیں کہ اگر میں ہدایت کا انکار کر دوں اور اللہ کو چھوڑ دوسرے الہوں کی پرستش کروں تو یہ ضلالِ مبین ہے۔ ہدایت و ضلالت کے راستے واضح ہیں۔

(۴) چوتھا موقع وہ ہے جب ضلالِ مبین کی اصطلاح اس سے بالکل مختلف انداز میں استعمال ہوتی ہے اور یہ موقع ہے کہ وہ لوگ کہ جن سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اپنے مال میں سے

انفاق کریں، رسولوں کی اس دعوت کو ضلالِ مبین قرار دیتے ہیں۔ مال کو جمع کرنے والے، اس کی پرستش کرنے والے، اکتناز کرنے والے لوگ انفاق فی سبیل اللہ کے راستے کو، اللہ کے دیئے ہوئے مال کو اللہ کی راہ میں انسان کی بہبود کے لئے خرچ کرنے کو بیّن طور پر غلط فلسفۂ حیات سمجھتے ہیں۔

(۵) پانچویں موقع پر مبین کا لفظ اس جگہ استعمال ہوا ہے جہاں اللہ تعالیٰ اہلِ جہنّم سے خطاب کر کے کہہ رہا ہے کہ اے بنی آدمؑ کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی اطاعت نہ کروگے اس لیئے کہ وہ تمہارا کھُلا ہُوا دشمن ہے اس کے وجود کی علّتِ غائی ہی یہ ہے کہ وہ تمہیں بہکائے اور گمراہ کرے۔

(۶) چھٹا موقع وہ ہے جب وحیٔ رسالت کو شعر سے ممتاز کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ ذکر اور قرآنِ مبین ہے حق اور ہدایت کا واضح اور مکمل مرقع ہے۔

(۷) ساتواں موقع وہ ہے جب یہ کہا گیا ہے کہ انسان اپنی خلقت کو بھُول کر اللہ تعالیٰ کا کھُلا ہُوا دشمن بن جاتا ہے اپنے ارادے اور قول اور فعل میں۔

لفظِ مُبین کے حوالے سے اب سورہ یٰسین کے مضامین کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے ذریعے ہدایت کرتا ہے یہ بلاغ مبین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام حقائق کو روشن کرتی ہُوئی کتاب نازل کی یہ قرآنِ مبین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو متنبہ کیا کہ شیطان تمہارا عدوئے مبین ہے مگر بندہ شیطان کو اپنا دشمن سمجھنے کے بدلے خود اللہ تعالیٰ کے خصیم مبین بن گئے۔ لفظ مبین کے حوالے سے زندگی کے دو متضاد نظریات اور اس لحاظ سے ضلالِ مبین کے دو متضاد تصور سامنے آتے ہیں۔ وہ جن کے قلب زندہ ہیں ان کے لئے ہدایت کو رد کرنا ضلالِ مبین ہے اس کے برعکس دُنیادار کافروں کے نزدیک خود رسولوں کی دعوت ضلالِ مبین ہے۔ کھُلا ہُوا ٹوٹے کا سودا ہے اور یہ تمام مضمون اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت کے سائے میں بیان ہورہا ہے، ان سب حقائق پر جو حقیقت

محیط ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی شان یہ ہے کہ وہی مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور اس کے علم کی شان یہ ہے کہ ہر شے کا احصار امام مبین میں کر دیا گیا ہے۔

سورۂ یٰسین کی زیرِ مطالعہ آیات میں جہاں انسان کو اللہ تعالیٰ کا خصیم مبین کہا گیا ہے وجہِ نزاع اور خصومت عقیدۂ آخرت ہے بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کے قانونِ سزا وجزا سے انکار اور اس انکار سے پیدا شدہ عمل و کردار ہے۔ مشرکینِ عرب اللہ کو تو مانتے تھے مگر حیات بعد الموت اور آخرت کا انکار کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو حیات کے زنداں میں مقید تھے، وہ اس دُنیا اور اپنی زندگی کو دیکھ کر اس بات کو تو مانتے تھے کہ کوئی اللہ ہے جو کائنات اور انسان کا خالق ہے مگر حیات بعد الموت کیونکہ حیات کے دائرے سے باہر تھی اس لئے وہ اس کا انکار کرتے تھے۔ زیرِ مطالعہ آیت میں کہا جا رہا ہے کہ مشرکین کے قیامت سے انکار کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنی خلقت پر غور نہیں کرتے، یہ نہیں سوچتے کہ خود ان کا عدم سے وجود میں آنا خود اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کتنا حیرت انگیز نشان ہے۔ اور بغیر سوچے سمجھے حجّت کر رہے ہیں۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور بے نیازی کی شان ہے کہ اس نے انسان کو جو ایک کرمِ حقیر ہے اس قدر اختیار اور آزادی دے دی ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ سے جھگڑنے والا بن گیا ہے۔ وہ اپنے رب کی تمثیل بیان کرتا ہے، اللہ کی شان اس سے پاک ہے کہ کوئی اس کا مثل یا مثل ہو۔ انسان اس کی مثل بیان نہیں کر سکتا اس لئے کہ وہ اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہے اور تمثیل بیان کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی حقیقت کو اس طرح واضح اور روشن طریقہ سے بیان کیا جائے کہ لوگ آسانی سے سمجھ لیں، اللہ اپنی مثل بیان کر سکتا ہے اور وہ مثل اعلیٰ ہے، انسان اس کی مثل بیان نہیں کر سکتا مگر جو لوگ عقیدۂ آخرت کے منکر ہیں وہ اس کی مثل بیان کرتے ہیں اور یہ مثل سوء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کے لئے ہمیں اپنے اسماء تعلیم فرمائے ہیں، مگر ہم اس کو صرف انہی اسماء سے پکار سکتے

ہیں جو اس نے تعلیم فرمائے ہیں مگر ہم اپنی طرف سے اس کا کوئی نام نہیں رکھ سکتے۔ اسی طرح ہمیں یہ اجازت نہیں ہے کہ اس کے بارے میں کوئی مثل بیان کریں۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے 'خصیم مبین' ہیں ان کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے مثل بیان کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی خلقت کو بھول گئے ہیں، وہ اپنی خلقت پر غور کئے بغیر بلا سوچے سمجھے حجت کر رہے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ بھلا جب یہ ہڈیاں گل سڑ جائیں گی تو ان کو کون دوبارہ زندہ کرے گا لیکن اگر وہ غور و فکر سے کام لیتے تو وہ خود اس حقیقت کو سمجھ سکتے تھے کہ جس نے انسان کو پہلی دفعہ خلق کیا، نیست سے ہست کیا اس کے لئے گلی ہوئی ہڈیوں میں جان ڈالنا کیا مشکل ہے، جو زندگی کا ابداع کر سکتا ہے اس کے لئے احیاء کرنا کیا بڑی بات ہے اور جس اللہ کو نشاۃ اولیٰ کی قدرت ہے اس کی نشاۃ ثانی کی قدرت کا انکار کیسے ممکن ہے جبکہ اس کی قدرت اور علم کی شان تو یہ ہے کہ اسنے جس چیز کو خلق کیا ہے پوری علم و حکمت کے ساتھ خلق کیا ہے۔

خصیم مبین وہ ہیں جو خود اپنی حقیقت سے غافل ہیں۔ وہ اس بات کو بھولے ہوئے ہیں کہ ان کی خلقت ایک نطفہ سے ہوئی ہے، یہ اللہ تعالیٰ ہے جس نے انہیں نیست سے ہست کیا ہے، انسان پر ایک وقت وہ بھی تھا جب وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ اسے عدم سے وجود، نیست سے ہست اور موت سے زندگی کی طرف لانے والا ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی حقیقت پر غور کر کے خود اپنی معرفت حاصل کر لیتے تو اس معرفت نفس کے ذریعے وہ معرفتِ الٰہی تک پہنچ سکتے تھے۔ وہ اس بات کو سمجھ سکتے تھے کہ جو اللہ زندگی کا ابداع کر سکتا ہے وہ احیاء کی قدرت بھی رکھتا ہے اور جس نے نشاۃ اولیٰ عطا کی ہے وہی نشاۃ آخری بھی عطا کر سکتا ہے۔ پھر وہ یہ سمجھ سکتے تھے کہ جو دلیل یعنی یہ کہ ہڈیوں کے گلنے کے بعد انہیں کون زندہ کر سکتا ہے وہ عقیدۂ آخرت کے خلاف پیش کرتے ہیں وہی دلیل عقیدۂ آخرت کا ثبوت بن جاتی ہے۔

جو لوگ عقیدۂ آخرت کا انکار کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اس دُنیا کو دارِ امتحان نہیں سمجھتے، جو اپنی زندگی کے مقصد سے غافل ہیں اس لئے ان کی زندگی کا واحد مقصد عیش کوشی اور لذّت اندوزی بن جاتا ہے اس کے برعکس جو عقیدۂ آخرت پر یقین رکھتا ہے وہ اس دُنیا کو دارِ امتحان سمجھتا ہے اور دُنیا میں اپنی زندگی کے حقیقی مقصد کی تلاش اور اس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرتا ہے، وہ اپنی خلقت پر غور کر کے اپنے نفس کی معرفت حاصل کرتا ہے اور معرفتِ نفس کے ذریعے معرفتِ الٰہی کی منزل تک پہنچ جاتا ہے وہ اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ انسان پر ایک وقت وہ بھی تھا جب وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہیں تھا اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اسے لباسِ وجود عطا کیا اور اس دُنیا میں پیدا ہونے کے بعد انسان کا اللہ تعالیٰ سے تعلق ختم نہیں ہُوا۔ بلکہ اس کی قدرت جو تخلیق کی شان میں ظاہر ہوتی ہے اس کے علم کی شان سے مربوط ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی شان یہ ہے کہ وہ ہر سطح پر موت سے زندگی کو برآمد کر سکتا ہے اور اس کے علم کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے علم سے ہر شے پر محیط ہے اور قدرت اور علم وہ صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ ذات ہیں۔

الغرض عقیدۂ آخرت کی سب سے پہلی اور بیّن دلیل خود انسان کا اپنا وجود ہے، جو لوگ عقیدۂ آخرت کے مُنکر ہیں ان کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ اپنی خلقت کو بھول گئے ہیں، انسان نیست سے ہست میں تبدیل کیا گیا ہے۔ اس پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہیں تھا اگر انسان اس بات پر غور کرے کہ اس حیاتِ دُنیا سے پہلے وہ کیا تھا اور کہاں تھا اور اگر انسان اس بات کا شعور حاصل کرے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہے جس نے اپنی قدرت اسے نیست سے ہست بنایا ہے تو پھر اس بات کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی کہ جو اللہ نیست سے ہست کرنے کی قدرت رکھتا ہے اس کے لئے زندگی کا احیاء کوئی مشکل بات نہیں ہے وہ خلاقِ علیم ہے اور اس کے علیم

ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ہر شے کو ایک قدر اور ایک اندازے کے ساتھ خلق کیا ہے اور ہر شے جو تخلیق کی گئی ہے وہ ایک مُعیّن وقت کے لئے تخلیق کی گئی ہے اللہ تعالیٰ کا علم ہر شے کی تقویم اور تقدیر پر محیط ہے اور ہر شے ہمہ وقت اس کی نگاہ میں ہے۔ گویا عقیدۂ آخرت یا حیات بعد الموت پر سب سے مستحکم اور بنیادی دلیل خود انسان کی نشاۃ اولیٰ ہے اور جس اللہ نے انسان کو پہلی دفعہ خلق کیا ہے وہی موت کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا۔

اس کے بعد کی آیت میں حیات بعد الموت پر دوسری دلیل پیش کی گئی ہے اور وہ آیت یہ ہے:

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾

"وہ وہی ہے جس نے تمہارے لئے ہرے درخت سے آگ پیدا کی۔ پھر اس سے تم اور آگ سلگا لیتے ہو۔"

تہذیبِ انسانی کی تین اہم بنیادیں

اس آیت کا مطالعہ کرتے وقت ایک اہم نکتہ کا ذکر کرنا ضروری ہے، جیسا کہ ہم نے اس سورت کے مطالعہ کے دوران اس سے قبل بھی ذکر کیا انسان نے تہذیب کے سفر میں جو ترقی کی ہے اس میں تین باتیں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ زمین سے اُگے ہوئے اناج اور پھلوں پر معاشی زندگی کے دارومدار کے زرعی دور کے علاوہ انسانی تہذیب کا ایک سنگ میل فطرت کی رکاوٹوں جیسے سمندر اور (ہمارے زمانہ میں فضا) کو مسخر کرکے ان میں سفر کے وسائل مہیا کرنا ہیں، دوسری اہم بات جس سے تہذیب کا سفر شروع ہوتا ہے جانوروں کو خود سے مانوس کرکے انہیں اپنا تابع بنانا ہے اور تیسری اور سب سے

قدیم اور اہم بات آگ کی دریافت ہے۔ سورۃ یٰس میں ان تمام باتوں کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت، قدرت، حکمت اور ربوبیت کی نشانیاں بیان کی ہیں مگر جہاں انسان کے خاص مرتبہ اور مقام کا ذکر آیا ہے وہاں خاص طور پر ان باتوں کی نشاندہی کی گئی ہے کہ

(i) اللہ تعالیٰ مُردہ زمین کو زندہ کرتا ہے۔ اناج اُگاتا ہے جسے انسان کھاتے ہیں میووں کے باغ بناتا ہے، چشمے جاری کرتا ہے اور اس طرح انسان کی تہذیب کے اہم زرعی دور کا آغاز ہوتا ہے۔

(ii) اللہ تعالیٰ نے انسان کو سمندر میں سواریاں فراہم کیں اور اسی طرح کے دوسرے واسطوں میں سواریوں کی بشارت دی! گویا فطرت کی وہ رُکاوٹیں جو انسان کی ترقی کی راہ میں حائل تھیں انھیں دُور کر کے تہذیبی ترقی کے لئے راہ ہموار کر دی۔

(iii) اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو انسان کے لئے مسخر کر دیا۔ اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے انسان کی تہذیبی ترقی کا سفر شروع ہوتا ہے دَرحقیقت انسانی معاشرہ دورِ وحشت سے متمدن دور میں داخل ہوتا ہے۔ انسان نے جانوروں کو خود سے مانوس کیا اور انہیں زراعت اور دوسرے کاموں میں استعمال کرنا سیکھا۔

(iv) اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کی۔ آگ کی دَریافت تہذیبی ترقی کے سفر میں سب سے قدیم اور اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اَب ہم خاص اس دلیل کی طرف آتے ہیں جو اس آیت میں پیش کی گئی ہے اور وہ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو درخت سے آگ پیدا کر سکتا ہے یعنی جو ایک شے میں سے بالکل مختلف شے پیدا کر سکتا ہے اس کے لئے انسان کو دوبارہ زندہ کرنا کیا مُشکل ہے۔ دَرخت اور آگ بظاہر دو مختلف چیزیں ہیں جیسے زندگی اور موت بظاہر مختلف اور متضاد نظر آتی ہیں لیکن انسان جن باتوں کو بالکل مختلف اور متضاد سمجھتا ہے ان میں

ایک گہرا تعلق بھی ہے کہ بغیر ایک کے دوسری شے پیدا نہیں ہوتی یہی تعلق موت اور زندگی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ زندگی میں سے موت اور موت میں سے زندگی کو برآمد کرنے والا ہے۔ دُنیا میں انسان کی زندگی کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں موت اور زندگی ساتھ ساتھ سفر کر رہی ہے، اور جس طرح اللہ تعالیٰ زندگی میں سے موت برآمد کرتا ہے اسی طرح وہ موت میں سے دوبارہ زندگی برآمد کر سکتا ہے۔ ہمیں موت اور زندگی دو متضاد چیزیں نظر آتی ہیں لیکن ان متضاد چیزوں میں بھی ایک باہمی تعلق ہے اور اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے ایک ایسی مثال بیان کی گئی ہے جسے ہم دیکھ سکتے ہیں اور محسوس کر سکتے ہیں، درخت اور آگ دو مختلف وجود ہیں۔ درخت کی سرسبزی اور اس کا ہرا بھرا ہونا پانی پر منحصر ہے۔ یہی درخت حرارت کو بھی جذب کئے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہرے بھرے درخت سے آگ برآمد کرتا ہے جو پانی سے مختلف اور متضاد شے ہے مگر یہ آگ درخت کے اندر موجود ہے۔ یہ وہ توانائی ہے جو درخت سورج سے حاصل کر کے اپنے اندر ذخیرہ کرتا رہتا ہے۔ جب ہم ہرے بھرے درخت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں پانی کے اثرات یعنی درخت کی سرسبزی اور شادابی تو نظر آتی ہے مگر ہم درخت میں پنہاں آگ کے وجود کو نہیں دیکھ سکتے پھر جب درخت کی ٹہنیوں کو آپس میں رگڑا جاتا ہے تو اس سے آگ برآمد ہو جاتی ہے گویا ایک وجود سے دوسرا وجود ظاہر ہوتا ہے اور پھر یہ آگ کا سلسلہ پھیلتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ وہ ایک وجود میں سے بالکل مختلف وجود نکال سکتا ہے۔ اسی طرح وہ موت میں سے زندگی کا برآمد کرنے والا ہے اور اس کے خلاق علیم ہونے کی شان یہ ہے کہ اس کے خلق کرنے کا کوئی ایک ہی طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ طریقے لامتناہی ہیں جن کا ہم علم نہیں رکھتے۔

جَعَلَ لَكُمْ میں اس کی شان رحمت اور کرم ہے کہ اس نے انسان کیلئے درخت سے آگ کو پیدا کیا۔ یہ انسان پر اللہ تعالیٰ کے خاص کرم کی نشاندہی کرتا ہے۔ درخت ہی

تمہیں پھل دیتا ہے، درخت ہی تمہیں سایہ دیتا ہے۔ درخت ہی تمہیں حرارت اور روشنی کے وسائل مہیا کرتا ہے۔

أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰى أَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۚ بَلٰى ۚ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾

(کیا وہ جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان کی مثل دوبارہ پیدا کرے۔ بیشک (وہ ضرور قادر ہے) وہ تمام علم رکھنے والا خلاق ہے)۔

بھلا وہ کہ جس نے اس سمٰوٰت اور ارض کو پیدا کیا ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ ان کے مثل پیدا کرے۔

حیات بعد الموت کے ذیل میں پہلی دلیل انسان کی نشاۃ اولیٰ ہے، دوسری دلیل درخت سے آگ کا پیدا ہونا ہے اور اب تیسری دلیل پیش کی جارہی ہے یعنی آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور جیسا کہ کلام پاک میں بتایا گیا ہے۔ سماوات وارض اور کائنات کی خلقت انسان کی خلقت سے بڑی بات ہے، یہ کائنات عالم کبیر ہے اور انسان عالم صغیر۔ ان دونوں عالموں میں ایک تعلّق ہے مگر یہ کبیر اور صغیر کا تعلق ہے، اس آیت میں یہ استدلال کیا جارہا ہے کہ وہ اللہ جو اس عالم کبیر کا خالق ہے، وہ جو اس کائنات کا خالق ہے کہ جس کی وسعت کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے اور خود انسان جس کا ایک حصّہ ہے اس کے لئے موت کے بعد زندگی پیدا کرنا بھلا کیا مشکل ہے۔

زیر مطالعہ آیت میں مِثْلَهُمْ کے معنی دو طرح بیان کئے گئے ہیں۔ مفسرین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ سے مُراد زمین اور آسمانوں کی تخلیق ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں جن آسمانوں اور زمین کو تخلیق کیا ہے وہ انسانی زندگی کے لئے فطری ماحول کی حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح وہ آخرت میں آسمانوں اور زمین کو تخلیق کرسکتا ہے تاکہ وہ حیاتِ آخرت کے لئے اس جہاں کے مُطابق فطری ماحول فراہم

کر سکیں۔ ان دونوں کے درمیان وجہِ مماثلت ان کا زندگی کے لئے مختلف دُنیاؤں کے مطابق فطری ماحول فراہم کرنا ہے۔

کچھ مفسرین کا کہنا ہے کہ مِثْلَهُمْ سے مُراد انسانوں کی مثل ہے آسمانوں اور زمین کی مثل نہیں ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ یہاں وجہ نزاع آسمانوں اور زمین کی تخلیق نہیں ہے بلکہ خود انسان کی نشاۃ ثانی ہے۔ علاوہ ازیں مِثْلَهُمْ میں هُمْ کی ضمیر ذوی العقول کی طرف رجوع کرتی ہے، اس اعتبار سے مِثْلَهُمْ سے مُراد انسانوں کی مثل ہے اور يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ سے مُراد موت کے بعد انسانوں کی نشاۃ ثانیہ ہے اور گویا موت جسم کی فنا اور نفس کا اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرلینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان پیدا کئے، اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ انسان کے نفس یعنی اس کے عین کو دوبارہ جسم عطا کردے جو اس جسم کے مثل ہوگا جو دُنیا میں تھا۔

اب ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیرِ مطالعہ آیات میں نشاۃ ثانی یا حیات بعدالموت کے لئے تین دلیلیں پیش کی گئی ہیں:

(i) انسان کی نشاۃ ثانی پر سب سے پہلی دلیل خود اس کی نشاۃ اولیٰ ہے جو اللہ انسان کو نیست سے ہست کرنے پر قادر ہے وہی انسان کو حیات بعدالموت عطا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

(ii) اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ زندگی سے موت اور موت سے زندگی برآمد کرسکتا ہے، اور اس کی مثال یہ ہے کہ وہ شجرِ اخضر سے آگ کو جو اس کے اندر اس طرح پنہاں ہے کہ نظر نہیں آتی پیدا کردیتا ہے۔

(iii) جو اللہ سمٰوٰت و ارض کا خالق ہے جو عالمِ کبیر کو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ انسانی نفوس کے لئے جن کو اس نے پیدا کیا ہے دوبارہ جسم پیدا کردے۔

بَلیٰ وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ "بیشک (وہ ضرور قادر ہے) وہ تمام علم رکھنے والا خلاق ہے۔"

اسمائے الٰہی:۔ خلاق اور علیم اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کے لئے اپنے کچھ اسماء تعلیم کئے ہیں اور یہ بھی اس کی رحمت ہے کہ اس نے ہمیں اپنے اسماء تعلیم کئے تاکہ ہم اس کی معرفت حاصل کرسکیں ورنہ ہمارے لئے اس کی معرفت حاصل کرنا ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء، اسماء حسنہ ہیں۔ ان اسماء کو تین اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) اسمِ ذات (۲) اسمِ صفاتِ ذات (۳) اسمِ صفاتِ فعل

ویسے اللہ کے ہر اسم میں اس کی کوئی نہ کوئی صفت جھلکتی ہے یہاں تک کہ اسم اللہ میں بھی جو اس کی ذات اور مجموعی صفات کے لئے ایک اسم ہے اس کی صفات کی جھلک ہے اس کے معنوں میں تین باتیں خاص طور پر شامل ہیں اوّل اس کا معبود یعنی الٰہ ہونا دوسرے اس کی کنہ میں عقلوں کا والہ و حیران ہونا اور تیسرے تمام سہاروں کے منقطع ہونے کے بعد انسانوں کا اس کی طرف رجوع کرنا ایک لحاظ سے اسم اللہ تمام صفات کا جامع ہے۔

اسمِ ذات اللہ تعالیٰ کے وہ اسم ہیں جو اس کی ان صفات کو ظاہر کرتے ہیں جو صرف اور محض اس کے ساتھ مختص ہیں اور جن کا کسی اور پر اطلاق ممکن ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات ایسی ہیں جو مجازاً انسانوں کے لئے استعمال ہوتی ہیں اگرچہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفت اور بندے کی صفت میں وہی فرق ہے جو فرق حقیقت اور مجاز میں ہوتا ہے مگر بعض صفات وہ ہیں جن کا مخلوق کے ساتھ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ان کو اسمِ ذات کہتے ہیں جیسے حیّ، قیّوم، العلی العظیم، العزیز۔

اِسمِ صفاتِ ذات اللہ تعالیٰ کی ان صفات کے مظہر ہیں جو اس کی ذات کو بیان

کرتی ہیں اور جو اس کی ذات سے اس قدر متصل ہیں کہ انہیں اس سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ قدرت اور علم صفاتِ ذات ہیں اور اکثر کلام پاک میں ان دونوں صفات کا ذکر آیا ہے۔ اس کی قدرت کی شان یہ ہے کہ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور وہ بِکُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر ہے اور اس کے علم کی شان یہ ہے کہ وُہی اوّل ہے وہی آخر ہے وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے اور وہ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْم ہے۔ وہ اپنی قدرت اور اپنے علم سے کائنات کی ہر شے پر محیط ہے۔

اِسم صفاتِ فعل اللہ کی وہ صفات ہیں جو انسانوں سے تعلق میں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ اس کے مختلف شیون ہے وہ محی ہے، وہ ممیت ہے۔ وہ غفور ہے، وہ منتقم ہے، وہی رحیم ہے، وہی قہار ہے، وُہی ہادی ہے اور وہی مضل ہے۔

اوپر کی آیت میں کہا گیا ہے "وَھُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْم" جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے وہ اس کو جانتا ہے، اور ہر شے کو اس نے علم و حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں ذرّہ برابر شے اِس سے اوجھل نہیں ہوتی اور اس میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی یا بڑی سے بڑی چیز ایسی نہیں جو کتاب مبین میں نہ ہو۔

یہاں اس کو "الخَلّٰقُ العَلِیْم" سے یاد کیا جا رہا ہے، اس کی خالقیت اس کی قدرت کا ایک ثبوت ہے۔ اس کا امر ہے۔ اور ہر شے جو خلق ہُوتی ہے اس کی ہر حالت حیات کی موت کی اور ان سے پہلے کی اور بعد کی اس کے علم کے احاطہ میں ہے۔ مَوت اور حیات کو اس نے پیدا کیا ہے۔ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے، وہ اوّل ہے وہ آخر ہے، وہ ظاہر ہے، وہ باطن ہے اور وہ ہر شے کو جانتا ہے اور ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کا علم اور قدرت ساتھ ساتھ ہیں۔ وہ اپنے علم اور قدرت سے ہر شے پر محیط ہے۔

"الخَلّٰقُ العَلِیْم" کی اس موقع پر مُناسبت یہ بھی ہے کہ یہاں موت میں سے

زندگی اور زندگی میں سے موت اور موت کے بعد تخلیق جدید کا ذکر ہے۔

اس آیۂ مبارکہ کی ابتدا میں جہاں اس کی رحمت اور ہدایت کا ذکر قرآن اور رسول کی صورت میں کہا گیا ہے وہاں العَزِیزُ الرَّحِیْمُ "کے اسم سے یاد کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں قدرے تفصیل شاید بے محل نہ ہوگی۔ العزیز اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنہ میں سے ایک اسم ہے جو اسمِ ذات ہے اور اس کے معنی ہیں وہ عزت اور طاقت والا جس کی طاقت ہر شے پر حاوی اور محیط ہے اور جس کے احاطۂ قدرت سے بچ کر کوئی نکل نہیں سکتا۔ کلام پاک میں العزیز کا اسم مختلف صفات کے ساتھ استعمال ہوا ہے جیسے العزیز الرّحیم، العزیز الحکیم، العزیز العلیم اور عزیزٌ ذو انتقام۔

جہاں اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت اور ہدایت کا ذکر ہے، جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سبب بندوں کی ہدایت کے لئے رسول بھیجے اور ان رسولوں پر کتابیں نازل کیں وہاں العزیز الرّحیم کا استعمال کیا گیا ہے جیسے سورۃ یٰسین کی ابتدا میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ ہدایت العزیز الرّحیم کی نازل کی ہوئی ہے۔

جہاں اس کائنات کی خلقت کا، اس کی تقویم اور تنظیم کا ذکر ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی شانِ حکمت کو ظاہر کرنے کے لئے العزیز الحکیم کی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔

جہاں مخلوقات کی تقدیر کا ذکر ہے یعنی جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کائنات کی ہر شے اپنے لئے مقرر کردہ نہج پر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کرتی ہوئی چل رہی ہے وہاں العزیز کے ساتھ علم کی صفت کا ذکر کیا گیا ہے جیسے سورۃ یٰسٓ میں نظامِ فطرت اور سورج اور چاند کے مقررہ مداروں پر چلنے کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ ذالک تقدیر العزیز العلیم۔

جہاں ظالموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے اور گنہگاروں پر عذاب کا ذکر آیا ہے وہاں عزیزٌ ذو انتقام کہا گیا ہے۔

اب اس بات کو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ سورۂ یٰسین میں چونکہ مضمون کا آغاز رسول

اور کتاب کے ذکر سے ہو رہا ہے اور چونکہ یہاں انسانوں کے لئے ہدایت کے اہتمام کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت کا ظہور ہے اس لئے شروع میں العزیز الرحیم کہا گیا ہے۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿۸۲﴾

"اس کی شان تو یہ ہے کہ جب کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ "ہو جا" بس وہ ہو جاتی ہے۔"

صاحب المیزان آقائے محمد حسین طباطبائی کا فرمانا ہے کہ یہ آیت دُرر الآیات میں سے ہے اس لئے کہ اس میں عالم یا عالم ملکوت کا ذکر کیا گیا ہے۔

اَمْرُہٗ ۔ مختلف تفسیریں

اَمْرُہٗ کے لفظی معنی ہیں اس کا امر یعنی اللہ تعالیٰ کا امر۔ اس کی تفسیر مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔

مفسرین کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اَمْرُہٗ کے معنی ہیں امر شان۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ جس وقت وہ کسی شے کے ابداع یا ایجاد کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے۔

اَمْرُہٗ کی ایک اور تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ کسی شے کے ابداع یا ایجاد کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا امر یہ ہوتا ہے کہ وہ اس شے سے کہتا ہے ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے۔ اس تفسیر میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس کے اَمر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اس کا امر کُنْ فَیَکُوْن کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

مفسرین کا ایک اور طبقہ جس میں مولانا اشرف علی تھانوی اور آقائے محمد حسین طباطبائی بھی شامل ہیں اَمْرُہٗ کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ سوائے اس کے اس کا اَمر نہیں ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی شے کے ابداع یا ایجاد کا تو وہ اس سے کہتا ہے ہو اور وہ ہو جاتی ہے۔ گویا ارادہ اور کُنْ فَیَکُوْن اس کے امر کی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ امر کا

اظہار کُنْ فَیَکُوْن میں ہوتا ہے۔ ہمارا رُجحان اسی تفسیر کی طرف ہے۔

امر اور خلق / ملکوت اور ملک

اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس شے سے کہتا ہے ہوجا، ہوجا۔ اس کی بابت بعض مُفسّرین نے اس اشکال کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اَمرِ کُنْ کسی شے کی ابداع یا ایجاد سے پہلے ہے اور جب کوئی شے ابھی ایجاد ہی نہیں ہوئی تو پھر اَمرِ کُنْ کا مخاطب کون ہے۔ اس کی توجیہ اس طرح کی جاتی ہے کہ ہر شے عالمِ خلق میں وجود پانے سے قبل علمِ الٰہی میں موجود ہے اَمرِ کُنْ کے ذریعہ علمِ الٰہی، عالمِ شہود میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ وہ تمام اشیا، جو عالمِ خلق میں موجود ہیں، وجود میں آنے والی ہیں یا موجود تھیں وہ ہمیشہ سے علمِ الٰہی میں موجود ہیں اور ہمیشہ موجود رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ کا علم ماضی، حال اور استقبال کی تقسیم سے ماوراً ہے اس لئے کہ اس کی نسبت سے وقت ہمیشہ قائم رہنے والا حال (ETERNAL NOW) ہے اور اس لحاظ سے تمام اشیاء کا مستقل احاطہ کئے ہوئے ہے اور جب اللہ کسی شے کو اَمر کرتا ہے تو وہ علمِ الٰہی سے عالمِ شہود میں ظاہر ہو جاتی ہے۔

دوسرے مفسرین کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس بات سے برتر اور ارفع اور پاک ہے کہ وہ اپنے اَمر کے ظاہر کرنے کے لئے کسی لفظ کے استعمال کا سہارا لے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کُنْ فَیَکُوْن محض ایک تمثیل ہے جسے ہمارے سمجھانے کے لئے بیان کیا گیا اور کیونکہ تمثیل ایسی بیان کی جاتی ہے جس سے لوگ مانوس ہوں تاکہ وہ آسانی سے سمجھ میں آسکے اس لئے یہاں تمثیل کو کُنْ فَیَکُوْن کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان عام طور پر تعمیلِ اَمر کے اسی طریقے سے مانوس ہیں کہ کسی اَمر کے بارے میں کوئی حکم دیا جاتا ہے اور پھر اس اَمر کی تعمیل کی جاتی ہے۔ گویا کُنْ فَیَکُوْن کے الفاظ تمثیل کے طور پر استعمال ہوئے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ کی شان اس

سے پاک اور بلند ہے کہ وہ اپنے امر کی تعمیل کے لئے الفاظ کو سہارا بنائے اور پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے امر کو کسی ایک خاص صورت یعنی کُنْ فَیَکُوْن کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کے بہت سے طریقے ہیں اور اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے اپنے امر کو ظاہر کرسکتا ہے۔

علماء تفسیر نے اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کُنْ فَیَکُوْن میں ف فصل کو نہیں بلکہ اتصال کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی اللہ کا اَمر کُنْ اور اس کی تکمیل یکون ایک ساتھ واقع ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی فصل یا بعد نہیں ہے۔ یکون کے بارے میں ایک اور بات نگاہ میں رکھنی ہے اور وہ یہ کہ یکون ماضی کا صیغہ نہیں ہے بلکہ مضارع کا صیغہ ہے جو حال اور استقبال دونوں پر محیط ہے۔ گویا صورت یہ نہیں ہے کہ امر کُنْ کے نتیجے میں یکون ہوا اور ختم ہوگیا بلکہ صورت یہ ہے کہ کُنْ کے امر سے ایک سلسلۂ تخلیق شروع ہوگیا اور یکون کا عمل مسلسل جاری ہے اور جاری رہے گا۔

جیسا کہ اس سے پہلے نشاندہی کی گئی ان آیات میں گفتگو کی سطح عالمِ خلق سے عالمِ امر کی طرف بلند ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے عقیدۂ آخرت اور حیات بعد الموت پر جو دلیلیں دی جارہی تھیں ان کا تعلق عالمِ خلق سے تھا اس لئے وہاں اسباب و علل سے متعلق گفتگو کی جارہی تھی۔ انسان کی خلقت اور شجر سے آگ پیدا ہونے کا ذکر ہو رہا تھا لیکن اب گفتگو عالمِ امر سے متعلق ہے اس لئے یہاں اسباب و علل کا ذکر نہیں ہے بلکہ اَمر یعنی کُنْ فَیَکُوْن کی بات ہو رہی ہے۔ امر کا تعلق عالمِ غیب سے ہے اور مومنوں کی پہلی صفت یہی ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ عالمِ غیب کے برعکس عالمِ شہود کا تعلق، محسوسات سے ہے، وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ تمام حقیقت محسوسات میں محصور ہے وہ عالمِ غیب پر ایمان نہیں رکھتے مگر جو لوگ اس بات کا شعور رکھتے ہیں کہ تمام حقیقت کو حسیات میں محصور نہیں کیا جاسکتا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ محض عالمِ شہود ہی حقیقت نہیں ہے بلکہ عالمِ شہود، عالمِ غیب کا پرتو اور اظہار ہے اور شہود غیب کا وہ پردہ ہے جو حقیقت کو

چھپائے ہوئے ہے اور اسے ظاہر بھی کر رہا ہے۔

عالمِ شہود عالمِ خلق ہے، عالمِ ملک ہے جس کا تعلق شہود، ظہور، مادے، صورت اور سلسلہ ہے اس عالم میں اسبابِ علل کا ایک سلسلہ ہے اور ایک وقت کا سلسلہ ہے جس میں ہر شے جکڑی ہوئی ہے۔

عالمِ غیب عالمِ امر ہے، عالمِ ملکوت ہے۔ یہ وقت اور سبب کے سلسلے سے ماوراء ہے اس کا تعلق بجائے وقت اور اسباب کے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے سے ہے۔

عالمِ خلق اور عالمِ امر میں بڑا گہرا تعلق ہے اور یہ تعلق اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ تمام خلق اور امر صرف اسی کے لئے ہے وہی بدیع السّمٰوٰت والارض ہے اور اس کے امر کی شان یہ ہے کہ جب قضائے امر ہو جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کُن اور وہ ہو جاتا ہے۔ اہم بات جو سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ سمٰوٰت و ارض کا ابداع اور عالمِ امر میں کُنْ فَیَکُوْن دو مختلف باتیں نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ اور بیک وقت ہوتی ہیں۔ جو چیز عالمِ غیب میں کُنْ فَیَکُوْن ہے وہ عالمِ خلق میں ابداعِ سمٰوٰت والارض ہے۔

عالمِ خلق اسباب و علل کا سلسلہ ہے اور عالمِ امر وقت اور اسباب و علل کے سلسلے سے ماوراء ہے۔ اللہ تعالیٰ کا امر عالمِ خلق میں اسباب و علل کے سلسلہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسان کی تخلیق کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس کے مختلف مدارج ہیں۔ انسان کو مٹی سے پیدا کیا پھر وہ تدریجی ارتقاء کے مرحلوں سے گزر کر اپنے کمال تک پہنچتا ہے پھر اس میں زوال شروع ہو جاتا ہے، گویا عالمِ خلق میں انسان اسباب و علل اور وقت کے سلسلے کے تابع ہے لیکن یہی بات عالمِ امر میں محض کُنْ فَیَکُوْن کی حیثیت رکھتی ہے۔

عالمِ غیب یا عالمِ امر اور عالمِ شہود یا عالمِ خلق میں ایک تعلق مسلسل قائم رہتا ہے جو چیز عالمِ غیب میں کُنْ فَیَکُوْن ہے وہ عالمِ خلق میں تخلیق کے مرحلہ کا آغاز ہے۔

قضائے امر اور تخلیق میں کوئی فصل یا بعد نہیں ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ عالم غیب کے وقت کا پیمانہ عالم شہود کے پیمانے سے مختلف ہے۔ عالم غیب ایک ہمیشہ قائم رہنے والا حال (ETERNAL NOW) ہے جبکہ عالم شہود وقت کے سلسلے میں گھرا ہوا ہے۔ عالم شہود میں تخلیق کا سلسلہ وقت کے سلسلے کے تابع ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا امر کُنْ فَیَکُوْن زمان و مکان کی قید سے ماوراء ہے اور خود اللہ تعالیٰ کا امر بھی محض کُنْ فَیَکُوْن میں منحصر نہیں ہے، کُنْ فَیَکُوْن قضائے امر کی ایک تمثیل ہے۔ اس کے امر کی ایک اور مثال ایسی ہے جیسے پلک کا جھپکنا جو ناقابل تجزیہ وتقسیم ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنے امر کو ظاہر کرے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ارادے کا تعلق ہے کلام پاک کی آیات کی روشنی میں ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور قضائے امر ایک ہی شے ہے۔ یعنی یہ صورت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی امر کا ارادہ کرتا ہے اور پھر وہ بات ہوتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کی صورت یہ ہے کہ جب وہ کسی امر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ امر پورا ہو چکا، گویا قضائے امر اور ارادۂ الٰہی ایک ہی بات ہے۔

یہاں تک گفتگو اشیاء کی خلقت سے متعلق تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کا امر صرف اشیاء کی تخلیق تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کی تقدیر پر بھی حاوی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو چھ ادوار ستہ ایام میں خلق کیا پھر وہ اپنے عرش اقتدار پر قائم ہو گیا۔ گویا اللہ تعالیٰ اس کائنات کو خلق کرنے کے بعد اس سے غیر متعلق نہیں ہو گیا بلکہ یہ تمام کائنات اور اس کی تنظیم و تدبیر اس کے امر کے تابع ہے۔ تدبیر امور کا سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ فطرت کے قوانین اس کی تنظیم اور توازن اسی کے امر سے قائم ہے۔ آسمان سے امر زمین کی طرف نازل ہو رہا ہے اور پھر تمام امور انجام کار اسی کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ زمین اور آسمان کا تعلق عالم خلق اور عالم امر کے تعلق کا اشارہ ہے اور یہ تعلق مسلسل جاری ہے۔ یہ کائنات

اللہ تعالیٰ کی تدبیرِ امور کے ذریعہ جاری ہے اور اس کی حرکت اور ارتقاء کے پسِ پردہ
درحقیقت اسی کا امر کارفرما ہے، بالفاظِ دیگر عالمِ خلق میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ
کے امر کا ظہور ہے۔

تدبیرِ امور عالمِ فطرت میں بھی ہے اور عالمِ تاریخ میں بھی اللہ تعالیٰ کا امر کارفرما ہے۔
اس کائنات کی ایک جہت عالمِ فطرت ہے، دوسری عالمِ تاریخ، عالمِ فطرت کے قوانین،
اس کی تنظیم و توازن اور اس کی حرکت اللہ تعالیٰ کے امر کے تابع ہے۔ اسی طرح عالمِ تاریخ
کے تمام بڑے فیصلے اللہ تعالیٰ کے امر کا مظہر ہیں۔ تمام امر اسی کے لئے ہے اور کسی مسئلہ
پر اس کا امر جاری ہونا اور عالمِ خلق میں اس کے اسباب فراہم ہونا ایک ہی بات ہے۔
اعتبارات مختلف ہیں۔

فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْهِ
تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

"پس وہ ذات ہر نقص سے منزہ ہے جس کے ہاتھ میں ہر شے کی ملکوت ہے اور تم
اس ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

ہم اس سورہ مبارکہ کے سایہ رحمت میں ذکرِ مبین کے اس سفر کے آخری مرحلے
میں آپہنچے۔

۱۔ اس سفر کا آغاز عالمِ ملک و شہادت میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور رحمت کے ذکر
سے ہوا جو کتاب اور رسول کی صورت میں بندوں کو علم و حکمت سکھانے والی اور صراطِ مستقیم
دکھانے والی ہے۔ آغازِ سفر ہی میں ہمیں محروم و مقبول چہروں سے روشناس کرایا گیا۔
اور ہمیں یہ بشارت دی گئی کہ چھوٹی بڑی ہر شے کا حساب محفوظ ہے اور یومِ حساب
حق ہے۔

۲۔ پھر ہم نے ایک انجام سے بے خبر دنیا پرستی کی غفلت میں کھوئی ہوئی ایک

بستی کو دیکھا یہ ساری دُنیا کی تمثیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولوں کے ذریعے اس پیغام کو پہنچانے کا اہتمام بھی دیکھا جس میں افراد کی نجات ہے اور قوموں کی زندگی ہے لیکن کم تھے وہ بہت کم" جو دُنیا سے اپنے دل کو ہٹا کر اللہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہم نے لوگوں کا حق کے متعلق تضحیک اور استہزاء کا رَویّہ دیکھا۔ اس رَویّہ پر بے پایاں محبت اور شفقت سے بھری ہوئی حسرت بھی دیکھی اور اس رَویّہ پر حسرتناک انجام بھی دیکھا۔

۳۔ اب ہم اقوام کے عروج و زوال کی سطح سے بلند ہو کر آفاق اور انفس کے عالم میں آگئے۔ جہاں ہمیں روز مرّہ کے معمولات اور مشاہدات میں اللہ تعالیٰ کی عظیم آیات دکھائی دیں۔ اس عالم میں ہم نے موت میں سے زندگی کو پیدا ہوتے دیکھے۔ زندگی کے قیام اور بقار میں اللہ کی ربوبیت کی آیات دیکھیں اور تمام جہاں ملک و شہادت میں اس ہی کی قدرت اور حکمت کو جاری ہوتے ہوئے اور امر کو نافذ ہوتے ہوئے دیکھا۔

اِنسان کے لئے اس زبردست اہتمام اور تدابیر امور کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ تقویٰ اختیار کرتا مگر وہ ہر آیت سے مُنہ موڑ کر کثرت کی ہوس اور دوسروں پر اپنی بڑائی جتانے کے شوق میں اس درجہ محو ہوا کہ وہ اس حقیقت کو ہنسی اُڑانے لگا کہ اس دُنیا کی حیات کی ایک مُدت مُعیّن ہے۔

۴۔ پھر یہ منظر دفعتاً ختم ہوتا ہے اور ہم اس مقام پر آگئے جہاں جہانِ آخرت کی جھلکیاں نظر آ رہی ہیں۔ یہ ایک دوسرا ہی عالم ہے جہاں ایک نئی سطح پر موت میں سے زندگی نکل رہی ہے۔ آنکھوں سے پردے ہٹ رہے ہیں۔ انسان اپنے رب کے حضور میں کھڑا ہے۔ تمام حقیقتیں بے نقاب ہیں۔ یہ میدانِ عدل ہے۔ ہر شے اپنے اپنے صحیح مقام پر پہنچ گئی۔ اہلِ جنّت رحمت و قرب و سلام کی دُنیا میں ہیں اور مجرم اپنے کرتوتوں پر قائل کئے جا رہے ہیں۔ خود ان کے اعضاء۔ ان پر گواہی دے رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ بصیرت اور حرکت جیسی نعمتوں کی (صحیح راستہ دیکھ کر اس

پر چلنے کی صلاحیت کی) ناشکری پر زندگی ہی میں یہ انعامات ان سے چھیننے کا حق رکھتا تھا۔

۵۔ عالمِ انفس اور آفاق میں اللہ کی ربوبیت اور رحمت کی آیات بھی دیکھیں۔ اور اب ہم عالمِ خلق سے بہت دور آگئے جہاں وقت کے ساتھ ساتھ ہر شے کا زوال ہے جہاں انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنا کر پیدا کیا اور جہاں انسان نصرت کی موہوم پر غیر اللہ کو اپنا الٰہ بنا رہا ہے اور اللہ سے کٹ کر طاغوت کے گروہ میں شامل ہو رہا ہے اور اللہ سے جھگڑ رہا ہے۔

اب ذکر کی منزل عالمِ خلق سے عالمِ امر پر آگئی۔ یہ اَمرِ کُنْ کا مقام ہے۔ یہ تمام دُنیاؤں کے اور تمام زمینوں اور آسمانوں کے ایجاد اور خلق کا سرچشمہ ہے۔ یہاں ماضی اور مستقبل اور حال کا تمام علم ایک لمحہ حال کی طرح مستحضر ہے۔ یہاں اللہ ہی اللہ ہے یہاں غیب شہود ہے اور عالمِ شہادت اس ہی عالم کا پرتو ہے اور ہر شے کو اللہ نے خلق کیا اور ہر شے اپنی تقدیر کو پوری کرتی ہوئی اس ہی کی طرف رجوع کر رہی ہے۔ قومیں ہوں یا افراد، اسی ہی کے حضور میں ان کو پہنچنا ہے اور وہیں جمع ہونا ہے۔

يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (۸۴/۶)

"اے انسان تو اپنے رب کی طرف مشقتیں اٹھاتا ہوا چلا جا اور بالآخر اس سے ملاقات کرنے والا ہے۔"

ملک بھی اسی کا ہے۔ ملکوت بھی اسی کی ہے۔ خلق بھی اس ہی کی ہے۔ حمد بھی اسی کی ہے۔ اس کا دامنِ عزت ہر قسم کے لوث سے پاک ہے اور بے شک وہ پاک ہے ان تمام چیزوں سے جنہیں لوگ اس کا شریک گردانتے ہیں اور اس کی ذات منزہ ہے اس کی صفات سے۔

جس سفر کا آغاز عالمِ خلق و ملک میں، اللہ کی ہدایت اور رحمت سے ہوا تھا اس

سفر کا خاتمہ عالمِ اَمر و ملکوت میں اس کے علم اور قدرت اور ارادے کے ذکر پر ہو رہا ہے جو اس کی احدیت کی شعاعیں ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطالعۂ قرآن

مطالعۂ قرآن ایک سلسلہ ہے۔ مختلف قرآنی آیات اور سورتوں کو بقدرِ فہم اور بقدرِ ظرف سمجھنے کی کوشش کا۔

اس مطالعے کے متعلق قرآنی تفسیر ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ البتہ اس مطالعہ میں اکثر معتبر تفاسیر سے استفادہ کیا گیا ہے۔

مطالعۂ قرآن کے لئے اولین شرط تو یہی ہے کہ علم کا طالب اور معنی کا متلاشی اپنے آپ کو اپنے نظریات، توہمات، مفادات، رجحانات سے فارغ کرے اور تا حدِ امکان اپنے آپ کو "اُمّی" بنا لے۔ حقیقت کا نقش اسی لوح پر ثبت ہوتا ہے جو پاک و صاف ہو۔ قطعی طور پر تو اس کیفیت کا حصول انسانی فطرت کے لئے ناممکن ہے لیکن اس جد و جہد اور مراقبہ کا یہ نتیجہ ضرور ہوگا کہ موضوعی عنصر معروضی حقیقت پر غالب نہیں آئیگا بلکہ اسکو اُبھارنے میں پس منظر کا کام دے گا۔ اور معنی کا متلاشی اپنی رائے سے تفسیر کرنے اور قرآن کے معنی کو اپنی مُراد پر ڈھالنے کے عظیم گناہ اور شدید گمراہی سے بہت حد تک محفوظ رہے گا۔

اس مطالعہ میں ابتداً آیات کے الفاظ کو حتی الوسع سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیشک حضورؐ اور آئمہؑ کی روایات میں وارد ہوا ہے کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ اور بے شک الفاظ کا تعلق ظاہر ہی سے ہے۔ لیکن الفاظ ہی تو باطن کی کنجی ہیں۔

آیات کی نظم و ترتیب خود حضورؐ نے اللہ کی ہدایت کے مُطابق کی ہے جو کسی تاریخی ترتیب کے مقابلے میں بدرجہا پُر معنی ہے اور ہر آیت ایک وحدت ہے اور آیتوں کی وحدت مل کر سُورت کی ایک وحدت ہے اور تمام سُورتیں مل کر قرآن کی ایک وحدت ہے اور یہ وحدت در وحدت، در وحدت ایک ہی وحدت ہے۔ اسطرح ہر آیت قرآن ہے یا یوں کہو کہ قرآن ایک نقطہ کی وحدت ہے اور یہی نقطہ سُورتوں اور پھر آیتوں میں پھیل کر نمایاں ہوا ہے۔ قرآن ادب کی آخری حد ہے یہ انسانی زبان میں خدا کا کلام ہے۔ ہر ادب کا منتہیٰ یہی ادب ہے لیکن اس تک کوئی ادب پہنچ نہیں سکتا اور ادب ہی کی حیثیت سے، انکی سورتوں کا مطالعہ کیا جا رہا ہے، گو وحدتِ قرآنی کے شعور کی منزل دور ہے، بہت دُور، بہت ہی دور۔

کس ندانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید